اللہ تعالیٰ کا انسانوں
اور
اہل ایمان سے مطالبہ

ترتیب وتالیف

رحمت اللہ بٹر

مرکزی ناظم دعوت، تنظیم اسلامی

شائع کردہ

شعبہ دعوت

مرکزی دفتر: 67۔اے علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو لاہور

فون: 6316638-6366638 فیکس 6271241

نام کتاب____ ''اللہ تعالیٰ کا انسانوں اور اہل ایمان سے مطالبہ''

طبع اوّل (ستمبر 2004ء)______________1000

طبع دوم (دسمبر 2005ء)______________1000

ناشر__________________شعبہ دعوت تنظیم اسلامی

مقام اشاعت__67۔اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور

مطبع______________________جی ڈی ایس پرنٹرز

FDkhan/Allahkainsanooorahlayimansaymutaliba

عبادتِ رب

دین اسلام جو مشتمل ہے ایمانیات، عبادات، رسومات، معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام پر۔ جو ہماری زندگی کے مختلف گوشے ہیں۔ ان کو پہلے مضامین میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب ہمیں جاننا ہے کہ اس دین کی رو سے ہر انسان سے اللہ تعالیٰ کا کیا مطالبہ ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کو اپنا رب ماننے والوں سے کیا تقاضا ہے تاکہ ہر انسان یہ جان لے اور اپنے لئے کامیابی کی سیدھی راہ اختیار کر سکے۔

پہلا مطالبہ جو پوری انسانیت سے ہے وہ ہے عبادتِ رب۔

قافلہ تنظیم اسلامی میں شمولیت کے بعد یہ احساس بیدار ہوا کہ بحیثیت مسلمان ہم میں سے ہر ایک پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مقصد کو پورا کرے اور محمد ﷺ کے امتی ہونے کے تعلق سے دین کے وہ فرائض ادا کرے جو اس پر عائد ہوتے ہیں۔ نتیجتاً قرآن مجید کی طرف رغبت بڑھی اور اس کا مطالعہ ہونے لگا۔ بہت سی حقیقتیں تو محترمی و مربی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ کے دروس سے منکشف ہوئیں لیکن بعض کی طرف قرآن مجید نے از خود رہنمائی کی۔ ان حقائق میں سے ایک حقیقت ''عبادتِ رب'' ہے۔ عبادت اور رب کا تعلق اور پھر بندگی کے تقاضے ایک ترتیب سے ذہن میں ایسے سمائے کہ بہت سے اشکالات خود بخود حل ہو گئے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کے ذریعے جو فرائض دینی کا تصور علیحدہ علیحدہ اصطلاحات کے ذریعے سامنے آیا تھا وہ ایک نئی ترتیب سے واضح ہوا اور جب راقم الحروف نے تربیت گاہوں میں ''فرائض دینی کا جامع تصور'' کے موضوع پر لیکچر دینا شروع کیا تو اسی ترتیب کے ساتھ رفقاء کے سامنے بات رکھنے کی کوشش کی۔ اب تحریر کے ذریعے کوشش کر رہا ہوں کہ اس فکر کو عام کروں۔ تحریر و تصنیف کے ضمن میں اپنی بے بضاعتی کا احساس ہے' لیکن اللہ کے بھروسے پر اس کام کا آغاز کیا ہے۔ **وللہ التوفیق فی الاولی والاخرۃ.**

سورۃ یٰسین میں اللہ تعالیٰ نے پیشگی آگاہ کر دیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انسانوں سے باز پرس کریں گے جنہوں نے اللہ کی عبادت پر اپنی زندگی نہ گزاری ہوگی۔

﴿اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ اَلَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ o وَّاَنِ اعْبُدُوْنِىْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ﴾ (یٰسین:**60-61**)

''اے بنی آدم! کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی عبادت نہیں کرو گے کیونکہ وہ تو تمہارا کھلا دشمن ہے اور یہ کہ تم میری ہی بندگی کرو گے۔ یہ تھا سیدھا راستہ (جو تمہیں اختیار کرنا چاہئے تھا)''۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی کوئی ایسا عہد ہے جو ہم نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا جس کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ قرآن مجید اس بات کا جواب اثبات میں دیتا ہے کہ ہاں ایسا ہوا تھا۔ چنانچہ سورۃ الاعراف میں اس کا بڑے اہتمام سے ذکر کیا گیا ہے:

﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِىْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ o اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ o وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ o﴾ (الاعراف:**172-174**)

''(یاد کرو) جب تیرے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان کو خود ان کی جانوں پر گواہ ٹھہرایا اور پوچھا: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ (اس پر) تمام انسانوں نے اقرار کیا: کیوں نہیں! ہم اس پر گواہ ہیں۔ (ہم نے یہ عہد اس لئے لیا کہ) مبادا تم قیامت کے دن یہ کہہ دو کہ ہم اس سے غافل تھے یا یہ کہ ہمارے باپ دادا نے شرک کیا ہم سے پہلے اور ہم ان کی اولاد تھے (اس لئے ہم بھی مشرک ہو گئے) تو کیا تو ہمیں ان غلط کار لوگوں کی وجہ سے ہلاکت میں ڈالے گا؟ ہم اس طرح کھول کھول کر اپنی آیات کو بیان کر رہے ہیں تاکہ وہ باز آ جائیں اور ہماری طرف رجوع کریں۔''

گویا اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی طرف سے پیش کئے جانے والے دونوں بہانوں کو رد کرنے کے لئے یہ عہد لیا تھا۔ ایک یہ کہ وہ کہہ دیں کہ ہمیں تو کسی نے بتایا ہی نہیں کہ ہمارا رب کون ہے اس لئے ہم کس کی بندگی کرتے اور دوسرے یہ کہ آباء پرستی' تقلید یا زمانے کے چلن کا عذر بھی نہ رہے چنانچہ یہ عہد ہر انسان سے فرداً فرداً لے لیا گیا۔

اب یہاں دو باتیں توجہ طلب ہیں عہد تو اللہ کے رب ہونے کا لیا گیا لیکن باز پرس اس پر کی جا رہی ہے کہ میری بندگی کیوں نہیں کی۔

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ o﴾ (الذاریات:56)

''میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔''

اور اسی کو تمام جنوں اور انسانوں کی تخلیق کی غایت بھی قرار دے دیا گیا ہے:

دوم یہ کہ ہمیں تو یہ عہد یاد ہی نہیں ہے اس لئے ہم اس کے تقاضے کیسے پورے کریں۔

پہلی بات یہ ذہن نشین کر لیجئے کہ یہ عہد یاد رکھنے والا نہیں ہے بلکہ اس کو فطرت میں سمو دیا گیا ہے کہ انسان جسے شعوری طور پر رب سمجھتا ہے اس کی بندگی لازماً کرتا ہے اور یہ فطرت تبدیل نہیں ہوتی۔ چنانچہ سورۂ روم میں فرمایا گیا:

﴿فَاَقِمْ وَجْهَکَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا' فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ﴾ (الروم:30)

''پس اپنے رخ کو اللہ کی اطاعت پر یکسو کر لو۔ یہ اللہ کی فطرت ہے جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جا سکتی۔''

یہی حقیقت ہے جس کو نبی اکرم ﷺ نے بایں الفاظ بیان فرمایا ہے:

((مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ وَفِی رِوَايَه اَوْ يُشَرِّکَانِهٖ)) مسند احمد

''ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے (یعنی فطرتِ اسلام پر) پھر اسکے والدین اسے یہودی' مجوسی یا نصرانی بنا دیتے ہیں''۔ (ایک اور روایت میں آیا ہے کہ ''یا اسے مشرک بنا دیتے ہیں۔''

یعنی یہاں اس کا رب بدل دیتے ہیں فطرت نہیں بدلتی۔ رہا پہلا سوال کہ عہد رب ہونے کا لیا ہے اور پوچھا جا رہا ہے بندگی کے بارے میں تو اس کو سمجھنے کے لئے جاننا ہوگا کہ رب کسے کہتے ہیں اور رب کو ماننے کا تقاضا کیا ہے۔ تو جان لیجئے کہ عربی میں رب کے بنیادی معنی مالک کے ہیں۔ جیسے رَبُّ الدَّارِ گھر کا مالک رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آسمانوں اور زمین کا مالک۔ مولانا علی میاں نے سیرت حضرت علیؓ میں وہ واقعہ نقل کیا ہے جب ابرھہ نے جو یمن کا بادشاہ تھا خانہ کعبہ کو گرانے کے ارادے سے مکہ پر چڑھائی کی تھی۔ وہ جب مکہ پہنچے اور پڑاؤ کیا تو اس کے لشکری عربوں کے اونٹ گھیر لائے۔ ان میں حضرت عبدالمطلب کے اونٹ بھی تھے۔ چنانچہ وہ ابرھہ کے پاس گئے۔ اس نے بڑی آؤ بھگت کی کہ سردار مکہ آیا ہے۔ میری منت سماجت کرے گا۔ لیکن حضرت عبدالمطلب نے کہا تو یہ کہ میرے اونٹ واپس کر دو۔ اس پر اسے بہت حیرت ہوئی کہ تمہیں اونٹوں کی پڑی ہے اور میں تمہارا معبد گرانے آیا ہوں۔ اس پر حضرت عبدالمطلب نے کہا ﴿اَنَا رَبُّ الْاِبِلِ وَاِنَّ لِلْبَيْتِ رَبًّا سَنَمْنَعُهٗ﴾ میں اونٹوں کا مالک ہوں، اس لئے اونٹ لینے آیا ہوں اور بے شک بیت اللہ کا بھی ایک مالک ہے وہ اس کی خود حفاظت کرے گا۔ تو انہوں نے لفظ رب استعمال کیا مالک کے لئے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ کعبہ کو اللہ ہی کا گھر مانتے تھے۔

سورۂ قریش میں خاص طور پر یہ لفظ اسی مفہوم میں آیا ہے اور اسی بنیاد پر قریش مکہ سے بندگی کا تقاضا کیا گیا ہے:

﴿فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ o الَّذِیْ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ o﴾ (قریش : 3`4)

''ان کو بندگی کرنی چاہئے اس گھر کے مالک کی جو انہیں بھوک میں کھانا کھلاتا ہے اور خوف سے امن بخشتا ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ یہی دو صفات یا ذمہ داریاں ہیں جو ہر مالک کی ہوتی ہیں۔ یعنی جس کا وہ مالک ہے اس کی پرورش کا سامان مہیا کرے اور اس کی حفاظت کا بندوبست کرے اور یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن مجید انسانوں کے ذہن نشین کرواتا ہے کہ وہ اپنے مالک حقیقی کو پہچانیں تاکہ

وہ اس کی بندگی کریں۔ چنانچہ قرآن مجید کے شروع ہی میں انسانوں سے جو بندگی کا تقاضا کیا گیا ہے وہ اسی بنیاد پر کیا گیا ہے:

﴿یٰاَیُّھَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَo الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَo﴾

(البقرہ :21-22)

’’اے انسانو، بندگی کرو اپنے مالک کی جس نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں، تاکہ تم بچ جاؤ۔ (وہ مالک) جس نے زمین کو تمہارے لئے بچھا دیا ہے اور آسمان کو چھت بنایا ہے اور پھر اس نے بلندی سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعے سے تمہارے لئے انواع واقسام کے میوے پیدا کئے پس (اس کی بندگی میں) کسی کو اس کا ہمسر نہ ٹھہراؤ اور یہ حقیقت تم جانتے ہو (کہ رزق مہیا کرنے والا وہی ہے اور حفاظت کا بندوبست کرنے والا وہی ہے۔)‘‘ یہ دونوں صفات ایسی بیان کی ہے اللہ کے رب (مالک) ہونے کی کہ دنیا میں بہت سے سرکشوں نے رب ہونے کا دعویٰ تو کیا لیکن کسی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ زمین میں نے پیدا کی ہے یا آسمان میں نے بنایا ہے اور بارش میں برساتا ہوں۔ قرآن مجید نے اس لئے وہ نشانیاں بیان کی ہیں جو اصل مالک کے لئے مخصوص ہیں۔ یہ ’’مطالبۂ عبادت‘‘ اللہ کے رب ہونے کے ناطے ہے اور تخلیق کا ذکر تو اس لئے کیا ہے کہ جن کو تم رب مانتے ہو وہ تو اس کی مخلوق ہیں خواہ فرشتے ہوں انبیاء ورسل یا اولیاء اللہ۔ جیسے تم اس کی مخلوق ہو اور پھر رب کی صفات بیان کر دیں تاکہ اپنے رب کو پہچان لیں۔

دیکھئے کس طرح قرآن مجید نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا وَیَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا کُلٌّ فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍo﴾ (ھود:6)

’’اس زمین پر کوئی جاندار نہیں ہے مگر اللہ کے ذمہ ہے اس کا رزق، (اس لئے) وہ ہر مخلوق کی جائے قرار کو جانتا ہے اور اس کے لوٹنے کی جگہ کو بھی جانتا ہے۔ یہ سب کچھ واضح طور پر لکھا ہوا ہے۔‘‘

اسی طرح فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ......﴾ (النحل: 71)

’’اور اللہ ہی ہے جس نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری عطا کی ہے‘‘۔

اور یہی وہ حقیقت ہے جس کو بار بار قرآن مجید میں دہرایا گیا ہے کہ:

﴿اِنَّ رَبَّکَ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ اِنَّهٗ کَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرًا بَصِیْرًاo﴾ (بنی اسرائیل:30)

’’بیشک تیرا رب کشادہ کر دیتا ہے رزق جس کے لئے چاہتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ناپ تول کر دیتا ہے۔ بیشک وہ خوب باخبر ہے اپنے بندوں سے، اور ان کو دیکھ رہا ہے‘‘۔

اس معاملے میں انسان کو خاص طور پر مخاطب کر کے فرمایا:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَکُمْ خَشْیَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِیَّاکُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ کَانَ خِطْاً کَبِیْرًاo﴾ (بنی اسرائیل:31)

’’اپنی اولاد کو رزق کی تنگی کے ڈر سے قتل نہ کرنا، کیونکہ ہم رزق دینے والے ہیں ان کو بھی اور تمہیں بھی۔‘‘

تم جب آئے تھے تو کون سی ضمانت لے کر آئے تھے کہ تمہیں رزق مل جائے گا اور اب اوروں کیلئے فکرمند ہو۔ یہ خوب جان لینا چاہئے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے صلاحیتیں اور قوت کار بخشی ہے اور اس کائنات میں اس کیلئے وسائل بھی مہیا کئے ہیں کہ اپنی روزی حاصل کرے اور اس کیلئے محنت کرے لیکن روزی کا پالینا اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ واضح فرما رہے ہیں۔

چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ انسان جسے بھی اپنا روزی رساں، مشکل کشا اور محافظ سمجھتا ہے اسی کی بندگی کرتا ہے کیونکہ یہ اس کی فطرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کے ذریعے

انسانوں کو باور کرایا ہے کہ:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَا یَمْلِکُوْنَ لَکُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْہُ وَاشْکُرُوْا لَہٗ اِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ o﴾ (العنکبوت:17)

’’بے شک جن کی تم بندگی کرتے ہو اللہ کے سوا وہ تمہارے رزق کا کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ پس تم اللہ کے ہاں سے ہی رزق کے خواہاں بنو اور پھر اسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر بجالاؤ اور یاد رکھو کہ تمہیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (وہ پوچھ لے گا کہ اس کے دیئے ہوئے رزق کو اوروں کی طرف کیوں منسوب کیا اور پھر ان کی بندگی کیوں کی)۔‘‘

اصل بات تو یہ ہے کہ رزق اور اجل کا معاملہ ایسا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے معین کردیا ہے اور یہی دو خطرات ہیں جن کے بارے میں انسان اپنے مالک حقیقی کو چھوڑ کر دوسروں کو ان کا مالک و مختار سمجھ لیتا ہے تو ان کی طرف رجوع کرتا ہے اور ان باطل ارباب سے اپنے لئے روزی اور حفاظت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر ان ہی کا بندہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ حالانکہ رزق اور عزت کی حقیقت یہ ہے کہ

﴿فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰہُ رَبُّہٗ فَاَکْرَمَہٗ وَنَعَّمَہٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَکْرَمَنِ o وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰہُ فَقَدَرَ عَلَیْہِ رِزْقَہٗ فَیَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَھَانَنِ o﴾ (الفجر:15-16)

’’انسانوں کا معاملہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اس کو آزماتا ہے اور اسے دنیا کی آسائشوں سے نوازتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت بخشی ہے‘ اور جب وہ آزمائش کیلئے اس پر رزق میں تنگی کرتا ہے تو پکار اٹھتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کردیا ہے۔‘‘

حالانکہ دونوں کیفیتوں کا معاملہ صرف انسان کی آزمائش کے لئے ہے کہ وہ اس اجل معین کو کیسے گزارتا ہے اور اس رزق کو کس طرح حاصل کرتا ہے۔ آیا اللہ کو رب مان کر جائز طریقے سے محنت کرتا ہے یا بجائے خود مالی وسائل کو رازق سمجھ کر جائز و ناجائز ہر طرح کے ذرائع سے رزق حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بس یہی وہ فرق ہے جو اس کی زندگی کے بارے میں انسان کے تصور میں واقع ہوتا ہے۔ پھر وہ اسی تصور کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔ اگر کسی کو یہ یقین ہو جائے کہ

رازق اور زندگی کی مہلت دینے والا صرف مالک کائنات ہے تو پھر وہ اللہ کے سوا کسی اور کا بندہ نہیں بنتا‘ اور اپنی عزت نفس کسی بھی قسم کی لالچ میں آکر نہیں بیچتا‘ بلکہ ہر مشکل میں اپنے مالک حقیقی کی طرف رجوع کرتا ہے اور ہمیشہ جائز محنت کرتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ رزق دینے والے کے ہاتھ میں میرا رزق ہے اور اس نے یہ وسائل جائز طریقے سے اور ظلم سے بچ کر استعمال کے لئے پیدا کئے ہیں اور یہی ہماری آزمائش ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

’’اے لوگو! کوئی چیز تمہیں زیادہ قریب نہیں کرتی جنت سے اور دور نہیں ہٹاتی دوزخ سے مگر جو میں نے تمہیں حکم کی ہیں اور کوئی چیز دور نہیں کرتی جنت سے اور نزدیک نہیں کرتی آگ کے مگر وہ جن سے میں نے روکا ہے اور جبرئیل علیہ السلام نے میرے دل میں یہ القاء کیا ہے کہ کوئی نفس اپنا رزق مکمل ہونے سے پہلے نہیں مرتا تو خبردار اللہ سے ڈرو (اس کی نافرمانی سے) اور پاک طریقے سے (رزق) چاہو اور رزق کی جلدی پالینے کی خواہش تمہیں ناجائز طریقوں سے حاصل کرنے پر آمادہ نہ کرے کیونکہ اللہ کے ہاں جو کچھ ہے اس کو اللہ کی فرمانبرداری ہی سے پایا جانا چاہئے۔‘‘ (بیہقی)

دوسری اہم بات یہ ہے کہ انسان عبث ایسی چیز کے پیچھے لگا رہتا ہے جو خود اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے یعنی رزق۔

تیسری بات اہم تر یہ ہے کہ انسان رزق کی ہوس میں سمجھ بیٹھتا ہے کہ حلال ذریعہ سے رزق تھوڑا حاصل ہوتا ہے اور حرام ذرائع سے جلدی اور زیادہ۔ حدیث اسے یہ سمجھاتی ہے کہ تمام مخلوق کا رزق اللہ کے پاس ہے تو پھر جس کے ہاتھ میں رزق ہے تم اس کی مخالفت کو کیسے رزق کا ذریعہ سمجھتے ہو یہاں حلال ذرائع پر اتنا ہی زور ہے جتنا تقویٰ پر (حرام سے بچنے پر) اور اس کا سہل نسخہ تقدیر ربانی کو یاد رکھنا ہے۔

دوسرا معاملہ ہے حفاظت کا‘ تو جان لیجئے اللہ تعالیٰ نے ہر شخص پر نگران معین کر رکھے ہیں جو اسکی حفاظت کرتے ہیں اور جب اجل معین آجائے تو کسی کو اسکے محافظ نہیں بچا سکتے خواہ کیسا ہی اس نے

حفاظت کا بندوبست کیا ہو۔ ﴿لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ﴾ (سورہ الرعد۱۱) ''ہر ایک پر نگران ہیں اس کے آگے اور پیچھے اور وہ اس کی حفاظت کرتے ہیں'' (جب تک موت کا وقت نہ آ جائے کچھ نہیں ہوتا) اور جب آ جائے تو فرمایا ﴿اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ﴾ (اے موت سے فرار چاہنے والو!) تم کہیں رہو موت تو تمہیں آ کر رہے گی خواہ بڑے بڑے محفوظ محلوں میں رہو۔ (النساء۷۰)

یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہئے کہ اس دنیا میں اللہ نے جس شخص کو جہاں اور جن حالات میں پیدا کیا ہے اس میں اس کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہے' بلکہ یہ تو وہبی ہے لیکن پھر اس دنیا میں اپنے مالک کو پہچان کر اور اس زندگی کی حقیقت کو جان کر اللہ تعالیٰ کی بندگی کا حق ادا کرنے میں اس کے لئے کامیابی ہے اور یہ امتحانی وقفہ غفلت اور مالک کی نافرمانی میں گزار دینے کا نتیجہ نامرادی ہے۔ جان لیجئے کہ انسان اس دنیا میں ان سے بھی یہی کچھ چاہتا ہے جن کا اسے مالک مجازی بنا دیا گیا ہے۔ سورۂ یٰسین میں فرمایا گیا:

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ﴾ (یٰسین۷۱)

''کیا یہ دیکھتے نہیں کہ ہم نے ان کے لئے چوپائے پیدا کئے ہیں اور ان کو ان کی ملکیت میں دے دیا ہے۔''

یہاں تھوڑا سا رک کر سوچئے کہ واقعی ہم نے قرآن مجید کو غور و فکر کے لئے اور سوچ سمجھ کر پڑھنے کے لئے مانا ہوا ہے یا پھر صرف ثواب کا ذریعہ بغیر سوچے سمجھے پڑھ کر۔ اور بُرا نہ مانئے اب تو قرآن مجید ثواب کے لئے نہیں بلکہ ایصال ثواب کے لئے رہ گیا ہے۔ حالانکہ یہ تو زندوں کو رہنمائی دینے اور آگاہ کرنے کے لئے نازل کیا گیا ہے چنانچہ اس سے پہلی آیت میں فرمایا کہ یہ قرآن ہم نے اس لئے آپؐ پر نازل کیا ہے کہ ﴿لِّيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ آپؐ آگاہ کر دیں ان کو جو زندہ ہیں اور کافروں پر حجت قائم ہو جائے اور وہ قیامت کے دن کوئی عذر نہ پیش کر سکیں کہ ہمیں معلوم نہ ہوا کہ زندگی کیسے گزارنا تھی۔ اب سوچئے اس پر اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں ذرا سوچو! ہم نے چوپایوں کو پیدا کر کے تمہاری ملکیت میں دے دیا ہے اس

لئے جس شخص نے کوئی جانور گھر میں رکھا ہوا ہو تو وہ حقیقتاً خود کو اس کا مالک گردانتا ہے چنانچہ کبھی اس سے پوچھئے کہ یہ جانور کس کا ہے' تو وہ فوراً کہے گا یہ میرا ہے۔ یعنی اس کا مالک میں ہوں چنانچہ وہ اس جانور کے لئے خوراک مہیا کرنے اور اس کی حفاظت کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے اور اس ذمہ داری کو نبھاتا بھی ہے۔ لیکن اس جانور کی پرورش اور حفاظت کا سامان کرنے کے بعد وہ اس پر اپنا یہ حق سمجھتا ہے کہ وہ جانور اپنے مالک کی فرمانبرداری کرے۔ اگر وہ جانور مالک کی مرضی پر نہ چلے تو اسے غصہ آتا ہے اور وہ جانور کو سزا دینے سے بھی نہیں چوکتا۔ ایسا اس لئے ہے کہ وہ اسے مالک کا حق سمجھتا ہے کہ اس کا غلام اس کا فرمانبردار ہو اور وہ حق بندگی ادا کرے۔ چنانچہ یہی وہ مطالبہ ہے جو مالک کائنات ہر انسان کے سامنے قرآن مجید میں رکھتا ہے جیسے فرمایا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ﴿اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ O﴾ ''اے لوگو! بے شک اللہ میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی' پس بندگی اسی کی کرو' اور یہی سیدھا راستہ ہے۔'' (ال عمران۵۱)

اب جان لیجئے بندگی کیا ہے؟ عبادت دو چیزوں کا مجموعہ ہے (محبت + اطاعت) یعنی مالک کو رب مان کر اس کی اطاعت، دل کی آمادگی کے ساتھ۔ گویا جس کے لئے انتہا درجے کی محبت ہو اور اس کی اطاعت کے تحت باقی سب فرمانبرداریاں ہوں وہ آپ کا رب ہے۔ جیسے فرمایا گیا سورہ توبہ میں:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ (توبہ :24)

''فرما دیجئے اگر تمہارے آباؤ اجداد' تمہاری اولاد' تمہارے بہن بھائی' تمہاری بیویاں' تمہارے رشتے دار اور وہ مال جو جمع کرتے ہو' وہ تجارت جس کے مندے کا ڈر رہتا ہے اور وہ رہائش گاہیں جو تمہیں بہت بھلی لگتی ہیں زیادہ محبوب ہیں اللہ اس کے رسول ﷺ اور اس کی راہ میں جہاد سے تو انتظار کرو (دفع ہو جاؤ) یہاں تک کہ اللہ فیصلہ فرما دے اور اللہ

ایسی نافرمان قوم کو راہ یاب نہیں کرتا'' اور جیسے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے **لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِی مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ** ''کسی مخلوق کی فرمانبرداری جائز نہیں جس میں خالق کی نافرمانی آتی ہے'' ابوداؤد یعنی باقی سب اطاعتیں اللہ کی اطاعت کے تابع ہوں۔

یہ بھی یاد رہے کہ اللہ پوری زندگی کا مالک ہے اس لئے وہ بندگی بھی پوری زندگی کی چاہتا ہے اور یہ اس کا حق ہے رب ہونے کے ناطے سے۔ جیسے تم اپنا حق سمجھتے ہو چوپایوں پر کہ وہ تمہاری اطاعت کریں اور وہ کام تمہاری مرضی کے مطابق کریں جن کے لئے تم نے ان کو پال رکھا ہے۔

اب آیئے اس دور کے اس مغالطے کی طرف کہ جس کی وجہ سے ہماری زندگیاں دورنگی کا شکار ہیں کہ ہم اللہ کو رب مانتے ہوئے بھی اس کی فرمانبرداری نہیں کر رہے اور اس کی عبادت کا پورا حق ادا نہیں کر رہے۔ پہلے تو لیجئے ان انسانوں کا معاملہ جو زبان سے تو اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے' لیکن ان کی زندگیوں میں اس کی شہادت نہیں ملتی کہ وہ واقعی اللہ کے بندے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں تو صدفی صد یہی بات سچی ہے کہ ان کا اللہ کے رازق اور محافظ ہونے پر بالکل یقین نہیں ہے بلکہ وہ درحقیقت وسائل و ذرائع ہی کو روزی رساں مانتے ہیں' یا اللہ کے سوا کچھ دوسری ہستیاں ہیں جن کے متعلق انہیں گمان ہے کہ ان کے قبضہ قدرت میں نفع و نقصان کا اختیار ہے۔

کچھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے اپنے ذریعہ معاش کو بھی اپنا رازق و محافظ سمجھ رکھا ہے' اور اس لئے وہ بڑی چاہت کے ساتھ اس کی بندگی کے تقاضے پورے کرتے ہیں وہ اپنا وقت اور اپنی صلاحیتیں بھرپور طریقے پر اس کے لئے نچھاور کرتے ہیں۔ باقی رہا کبھی کبھار نماز روزہ تو بس ایک رسم کے طور پر وہ بھی وگرنہ اللہ کے رب ہونے پر ان کو فی الواقع یقین کی کیفیت حاصل نہیں۔ اگر یہ یقین ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ وہ مالک کی رضا یا ناراضی کا خیال کئے بغیر اپنی روزی کی معاملے میں تو اپنا سب کچھ کھپا دیں لیکن اللہ کی فرمانبرداری کے بارے میں انہیں کبھی خیال تک نہ آئے۔ انہیں احساس ہی نہ ہو کہ مالک حقیقی نے کن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے اور کن کو حلال کن برائیوں سے منع کیا ہے اور کن فرائض کا پابند کیا ہے کن عبادات کو لازم کیا ہے اور کن لغویات سے روکا ہے۔ اگر

انہیں اللہ کے رب ہونے کا یقین ہوتا تو کیسے ممکن تھا کہ ان کو اللہ کی پکار پر لبیک کہنے کی توفیق نہ ہو لیکن دکان وقت پر ضرور کھولیں' انہیں اللہ کی ناراضی کا ڈر نہ ہو لیکن اپنے دفتر کے انچارج یا فیکٹری کے مالک کے بے دام غلام ہوں' انہیں اللہ کی رضا کا خیال نہ آئے لیکن وہ جسے اپنا رازق سمجھے بیٹھے ہیں اس کی چشم و ابرو کے اشاروں کو بھی پہچانیں اور ان کی خوشنودی کا کوئی موقع ضائع نہ جانے دیں۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا:

> ''جس نے صبح نماز سے شروع کی (اور پھر باقی کام کئے) تو اس نے ایمان کے جھنڈے تلے صبح کی اور جس نے صبح بازار کے کام کاج سے شروع کی (بغیر نماز پڑھے) تو اس نے شیطان کے جھنڈے تلے صبح کی''۔ (ابن ماجہ)

میں اپنی بات کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں جس کا بہت سے لوگوں کو تجربہ ہوا ہوگا۔ چند حضرات کہیں محفل میں بیٹھے ہوں اور اذان کی آواز آ جائے اور ان میں سے کچھ مسجد کے لئے اٹھیں اور دعوت دیں کہ نماز کے لئے چلیں تو باقی حضرات کی زبان پر یہ الفاظ آ جائیں گے کہ ہمارے لئے بھی دعا کرنا کہ ہم بھی نمازی ہو جائیں لیکن یہی لوگ صبح کو کسی سے نہیں کہتے کہ دُعا کرنا کہ میں دفتر چلا جاؤں یا دکان کھول لوں۔ بلکہ وہاں خود جاتے ہیں۔ ان کو اللہ کے رازق ہونے پر یقین نہیں ہے' اس لئے اس کے در پر کیوں جائیں؟ جہاں سے رزق حاصل ہونے کا یقین ہے وہیں تو جائیں گے! یہ ہے اصل معاملہ کہ ان کی اپنی فطرت انہیں مجبور کر رہی ہے کہ وہ اپنے اس ''رب'' کی فرمانبرداری کے تقاضے پورے کریں جسے وہ اپنا رازق سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے دل میں اصل مالک اور رازق حقیقی اللہ تبارک وتعالیٰ کے در پر جانے کیلئے آمادگی نہیں ہے کیونکہ اسے وہ مالک اور رازق مانتے ہی نہیں۔

اب دوسرے لوگوں کا جائزہ لیجئے۔ یہ وہ ہیں جن کو یقین ہے کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا بھی ایسی برگزیدہ ہستیاں ہیں جن کی خوشنودی حاصل کرنا اور جن کی اطاعت کرنا عبادت ہے' اس لئے کہ ان کے نزدیک ان ہستیوں کے ہاتھ میں رزق اور نفع و ضرر کا اختیار ہے۔ یہ لوگ بھی اپنے ان باطل ارباب کی عبادت کا حق ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے' لیکن کائنات کے اصل

مالک کی انہیں ذرا بھی پروانہیں ہے' اس لئے کہ وہ اپنا رب ان ہی ہستیوں کو قرار دے چکے ہیں۔ دیکھ لیجئے کہ بزرگوں کے مزارات پر حاضری میں کبھی کوتاہی نہیں ہوگی' ان کے عرس کے مواقع پر خالص اشیاء نذرانہ کے طور پیش ہوں گی' لیکن باقی پورا سال اللہ کے مقرر کردہ حرام وحلال کی نہ پرواہ کی جائے گی اور نہ ہی اس کے آگے سر بہ سجود ہونے کی۔ وہ زکوٰۃ ادا نہیں کریں گے' غریبوں اور مسکینوں کی بدحالی پر کبھی ان کا دل نہیں پسیجے گا' رشوت خوری یا ملاوٹ' اور ناجائز منافع خوری کی انہیں کبھی پروا نہیں ہوگی' اس لئے کہ یہ چیزیں تو اس اللہ نے حرام قرار دی ہیں جس کی نافرمانی کا انہیں کوئی خوف نہیں ہے۔

اب آیئے تیسرے طبقہ کی طرف' یہ وہ لوگ ہیں جو واقعی اللہ تعالیٰ کو ہی اپنا رب مانتے ہیں لیکن ان کے ہاں عبادت کا تصور یا تو محدود ہو گیا ہے یا مسخ شدہ ہے۔ ان لوگوں نے مراسم عبودیت اور اسلام کے ارکان ہی کو پوری عبادت سمجھ لیا ہے' باقی رہے تمدن' معاشرت' معیشت اور سیاست کے معاملات تو یہ ان کی نظر میں دنیاوی معاملات ہیں' جن کا عبادت سے کوئی سروکار نہیں۔ ہمارے مذہبی طبقات جو مختلف مسالک سے وابستہ ہیں اکثر و بیشتر اسی نظریہ کے حامل ہیں۔ اگرچہ زبانی طور پر تو وہ کہتے ہیں کہ دین زندگی کے تمام معاملات میں رہنمائی دیتا ہے لیکن عبادت کے لفظ کو انہوں نے صرف ارکانِ اسلام کے لئے خاص کر لیا ہے۔ اس دائرے میں وہ ذرا سی کوتاہی یا اختلاف کو برداشت کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں' لیکن زندگی کے باقی تمام معاملات میں ہر کسی سے اتحاد کرنے پر تیار ہوتے ہیں' خواہ وہ اسلام کو بطور دین مانے یا نہ مانے۔ گویا انہوں نے اسلام کو محض ایک مذہب کا درجہ دے کر اسے ہی کل دین سمجھ لیا ہے۔ ان کی مساجد' طریقہ نماز' مسائل روزہ وزکوۃ وحج تو مختلف ہیں لیکن طرز معاشرت' کاروبار اور طریق سیاست سب ایک جیسے ہیں' اور ان معاملات میں ان کا طرز عمل بالعموم اسلام کے مطابق نہیں ہے۔ ان کی تبلیغ اور بحث ومباحثے کی حدود بس مراسم عبودیت تک محدود ہیں۔ باقی رہا نظام معاشرت و معیشت وسیاست تو خواہ مشرکانہ یا ملحدانہ ہو انہیں اس کی اتنی تشویش نہیں ہے جتنی اپنے مسالک میں اختلاف کی۔ ان کے مدرسوں اور مساجد پر حکومت کنٹرول کرنے کی کوشش کرے تو مرنے پر

تیار ہوں گے لیکن طرز حکومت مغربی جمہوریت پر مبنی ہو' معیشت سودی نظام پر مبنی ہو' معاشرے میں بے حیائی اور بے حجابی کا دور دورہ ہو تو انہیں کوئی پرواہ نہیں کہ ان کو بدلنے کے لئے کوئی جدوجہد کی جائے۔ وہ بس اپنے مسلک کے مطابق عقیدہ رکھ کر اور عبادات ادا کر کے گویا پورا حق بندگی ادا کر رہے ہیں۔ جان لیجئے کہ مراسم عبودیت' ارکان یا ستون ہیں جن پر اسلام کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ لیکن یہ ستون بجائے خود عمارت نہیں ہیں۔ اسلام کی عمارت تو اصل میں پوری زندگی میں اللہ کو رب مان کر اس کی فرمانبرداری اور اطاعت کا نام ہے اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ ﴿وَمَا خَلقت الجن والانس اِلا لیعبدون﴾ (الذاریات ۵۶) ''اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر اس لئے کہ وہ میری بندگی کریں۔'' اگر نماز روزہ کو بندگی مان لیا جائے تو پھر تو انسان کو ہر وقت نماز روزہ سے ہی ہونا چاہئے کیونکہ پیدا ہی اس لئے کیا ہے۔ لیکن بندگی اصل میں اس کو رب مان کر پوری زندگی اس کی اطاعت کرنا ہے، دل کی آمادگی سے۔ انسان کس کی بندگی کرتا ہے اپنے مالک کی یا اپنے نفس کی۔ برادری کی' اصول تجارت کی اور مادر پدر آزاد جمہوریت کی یا اپنے رب کی۔ اس بات کا اصل ٹیسٹ تو ہوتا ہی زندگی کے اجتماعی معاملات میں ہے کہ انسان کس کا بندہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس لئے فرمایا: ﴿یٰا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً﴾ (البقرہ: 208) ''اے ایمان والو! اسلام (یعنی اللہ کی فرمانبرداری) میں پورے کے پورے داخل ہو۔'' اور فرمایا ﴿یٰا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ (آل عمران: 102) ''اے ایمان والو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے اور تم کو ہرگز موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو'۔ پوری زندگی کی روش اس کی فرمانبرداری پر ہو۔ رہن سہن، کاروبار اور دستور ریاست اس کی اطاعت پر ہو۔ بقول اقبال مرحوم ''چوں می گویم مسلمانم بہ لرزم' کہ دانم مشکلات لا الہ را'' یہ مکمل سپردگی (اسلام) نافرمانی سے بچنا' تقویٰ' پوری فرمانبرداری (اطاعت) بندگی رب ہی کی مترادف اصطلاحات ہیں۔ معاشرتی زندگی میں جب معاملہ آتا ہے رسومات کی ادائیگی کا تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان اللہ کو محافظ سمجھتا ہے اور انہیں رسومات پر اکتفا کرتا ہے۔ جو اللہ کے رسول ﷺ کی سنت

ہیں یا برادری کی ناراضگی کے ڈر سے غلط رسومات کو ادا کرتا ہے کہ اگر رشتہ دار ناراض ہو گئے تو زندگی گزارنا مشکل ہوگا۔ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کی ناراضگی سے نہیں ڈرتا بلکہ برادری سے تو کس کو محافظ سمجھتا ہے۔ اسی طرح معیشت میں اگر حرام ذرائع استعمال کرتا ہے اور حرام کھاتا ہے تو وہ رازق کس کو سمجھتا ہے اللہ کو یا ان ذرائع واسباب کو پھر اپنے تنازعات اور حدود اللہ میں وہ کس کو حکم مانتا ہے اور کس کے فیصلے کی پابندی کرتا ہے۔

ارکان اسلام تو اصل میں انسان کے نفس کی تربیت کا ذریعہ ہیں کہ اس کا تعلق اپنے مالک سے قائم رہے اور اس پر نسیان طاری نہ ہو جس کی بہترین صورت نماز ہے اور اپنے نفس کی خواہشات کا بندہ نہ بنے جس کے لئے روزہ ہے اور مال کی محبت اسے حرام میں نہ لے جائے جس کے لئے زکوٰۃ و صدقات ہیں اور وطن کی محبت اسے علیحدہ عصبیت پر نہ لے آئے جس کے لئے حج وعمرہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تمام کائنات کو انسان کے لئے پیدا کیا ہے تاکہ وہ ان تمام اشیاء کو کام میں لائے لیکن اس کی بندگی میں رہ کر یعنی اس کا ایمان وعقیدہ اس کے مراسم عبودیت، رسومات، طرز معاشرت، کاروبار ومعاش اور سیاست اللہ کے عطا کردہ نظام عدل وقسط کے تقاضوں کے تحت ہو اور وہ پوری زندگی میں اسی کو رب مان کر اس کی اطاعت کرے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو نوید خلافت دی ہے وہاں اس خلافت کی اصل غرض وغایت بھی اس عبادت کو قرار دیا ہے:

﴿وَعَدَاللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَّمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ (النور : 55)

''اللہ تعالیٰ کا تم میں سے ایمان اور عمل صالح کا حق ادا کردینے والوں سے وعدہ ہے کہ وہ ان کو زمین میں لازماً خلافت عطا کرے گا، جیسے اس نے خلافت عطا کی ان سے پہلوں کو اور وہ ان کے اس دین (اسلام) کو غلبہ عطا کرے گا جو اس نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے

اور ان کے خوف کو امن میں بدل دے گا۔ تاکہ وہ میری ہی بندگی کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں اور جو اس کے بعد بھی کفر کریں تو وہی نافرمان ہیں۔''

اللہ تعالیٰ اسی مقصد کے لئے اپنے رسولوں کو مبعوث فرماتا رہا ہے کہ وہ اس نظام عدل اجتماعی کو قائم کریں جس کی بدولت اللہ کی فرمانبرداری کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ یہ ہے وہ حق مالک ارض وسماء کا جو بحیثیت انسان ہم میں سے ہر ایک پر عائد ہوتا ہے۔ وہی مالک حقیقی ہے اور اسی کے ہاتھ میں ہر جاندار کا رزق اور اس کی زندگی کا اختیار ہے اور یہی فرمان نبوی ﷺ ہے کہ اللہ کا بندوں پر صرف یہی حق ہے کہ وہ اس کی بندگی کریں اور اس میں کسی کو شریک نہ کریں۔ اگر وہ یہ کر گزریں تو پھر بندوں کا یہ حق ہے کہ ان کا رب انہیں عذاب نہ دے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس شخص کے بارے میں فرمایا کہ جس نے اپنے نفس کی خواہشات کو اپنا الہ بنایا ہوا ہے۔ ﴿اَفَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ﴾ (الفرقان) آپ نے سوچا کہ انسان اپنی خواہش نفس کو نہ سجدہ کرتا ہے نہ رکوع بلکہ اس کا کہا مانتا ہے۔ ویسے بھی سوچیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو صرف اپنی بندگی کے لئے پیدا کیا ہے اور اگر نماز، روزہ ہی بندگی ہے تو پھر ہر وقت نماز روزہ میں رہنا چاہئے تاکہ مقصد زندگی پورا ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہے، اس نے تمام چیزیں جو زمین پر ہیں انسانوں کے لئے پیدا کی ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ انسان کو برتے لیکن میری فرمانبرداری میں رہ کر اور یہی مقصد ہے اس کی پیدائش کا۔ یعنی اپنے حق پر اکتفا کرے اور دوسروں کا حق نہ کھائے۔ طغیانی سے بچے اور یہ اسے بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کا حق کیا ہے۔ یہ پیمانہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دل میں رکھ دیا ہے کہ وہ اچھی طرح جانتا ہے بُرائی کیا ہے اور بھلائی کیا ہے۔ اس کا حق کیا ہے اور کیا اس کا حق نہیں ہے۔ اس بارے میں تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فرما دیا کہ اگر کوئی شخص اچھے طریقہ سے دلائل دے کر مجھ سے اپنے حق میں فیصلہ لے لیتا ہے لیکن اس کا دل یہ گواہی دیتا ہے کہ چیز اس کی نہیں ہے تو میرا فیصلہ بھی اسے جائز قرار نہیں دے گا اور وہ میرے ہاں سے آگ کا انگارہ لے کر لوٹا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ ہمیں واقعی اس کے بندے بن کر زندگی گزارنے کی توفیق دے اور ساری زندگی کی فرمانبرداری اختیار کر کے حق بندگی ادا کرنے کی ہمت دے۔

واخر دعوانا ان الحمد لله ورب العلمین O

(جاری ــــ حصہ نمبر 2)

دین اسلام کا ایمان والوں سے مطالبہ
بندۂ مومن پر لازم عبادت

﴿یاَ یُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ارۡکَعُوۡا وَاسۡجُدُوۡا وَاعۡبُدُوۡا رَبَّکُمۡ وَافۡعَلُوۡا الۡخَیۡرَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَO وَجَاھِدُوۡا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ ط ھُوَ اجۡتَبٰکُمۡ وَمَا جَعَلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ مِنۡ حَرَجٍ ط مِلَّۃَ اَبِیۡکُمۡ اِبۡرٰھِیۡمَ ط ھُوَ سَمّٰکُمُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ مِنۡ قَبۡلُ وَفِی ھٰذَا لِیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَھِیۡداً عَلَیۡکُمۡ وَتَکُوۡنُوۡا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ج فَاَقِیۡمُوالصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاعۡتَصِمُوۡا بِاللّٰہِ ط ھُوَ مَوۡلٰکُمۡ ج فَنِعۡمَ الۡمَوۡلٰی وَنِعۡمَ النَّصِیۡرُ O﴾
(حج۷۷.۷۸)

چند تمہیدی باتیں

1۔ قرآن مجید جس ترتیب سے نازل ہوا ہے اس ترتیب سے یہ پہلا خطاب ہے جو اہل ایمان کو مخاطب کر کے کیا گیا اور مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ آیات دوران ہجرت نازل ہوئیں یا ہجرت کے فوراً بعد۔

2۔ بندہ مومن کے جو انفرادی حیثیت میں فرائض ہیں ان کو بڑی جامعیت کے ساتھ معین کر دیا گیا ہے کہ کم از کم لوازمات نجات وفلاح کیا ہیں۔

3۔ امت مسلمہ کو بحثیت امت جو فریضہ سونپا گیا ہے اس کو بھی بیان کر دیا گیا ہے اور اس فریضہ کی ادائیگی کی وجہ سے جو مقام اور فضیلت اسکے حصے میں آئی ہے اس کا واضح طور پر ذکر کر دیا گیا ہے۔

اب پہلی آیت کا ترجمہ پڑھئے۔ ''اے ایمان والو! رکوع کرو سجدہ کرو۔ اپنے رب کی عبادت کرو اور بھلائی کے کام کرو تا کہ فلاح پا سکو۔''

سب سے پہلے اس بات کو سمجھ لیجئے جو ہمارے ذہنوں میں سمائی ہوئی ہے کہ مسلمانوں کے گھر پیدا ہو جانے سے آدمی مسلمان ہو جاتا ہے اور لاشعوری طور پر کلمہ شہادت یاد کر لینے سے

ایماندار بن جاتا ہے' اب دیگر فرائض ادا کرنے سے تو درجات میں بلندی ہوگی وگرنہ کامیابی تو اس اقرار کی بنیاد پر یقینی ہے۔ یہی ہے وہ تصور جو اس وقت معاشرے میں راسخ ہے اور جس کی بنیاد پر 90 فیصد آبادی اسلام کی بنیادی تعلیم نماز' روزہ' زکوٰۃ' حج' حلال رزق' راست بازی اور بنیادی اخلاقیات سے بھی فارغ ہے لیکن خود کو مسلمان گردانتی ہے۔ لیکن اس آیت مبارکہ میں تو خطاب ہی ان سے ہے جو اہل ایمان ہیں اور پھر ان کو حکم دیا گیا ہے کہ یہ کام کرو گے تو فلاح اور کامیابی حاصل کر پاؤ گے۔

ایمان والوں کو سب سے پہلے جو حکم دیا جا رہا ہے وہ ہے رکوع کرو' سجدہ کرو۔ مراد ہے نماز ادا کرو۔ جان لیجئے جس وقت یہ آیات نازل ہوئی ہیں تو اہل ایمان پر صرف نماز فرض ہوئی تھی۔ ابھی نہ روزہ فرض ہوا تھا اور نہ زکوٰۃ و حج۔ اس لئے نماز قائم کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔

آج جب ہم اس آیت کا مصداق سمجھیں گے تو وہ یہ ہوگا کہ ارکان اسلام یا عبادات کا التزام کرو۔ یہ بات بھی سمجھ لینے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندہ مومن کے لئے سب سے پہلے ان عبادات کو کیوں لازم کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کا خالق ہے اور اسے معلوم ہے کہ انسان کی تخلیق میں کیا کیا ضعف ہیں اور اسے اپنے نفس کو راہ راست پر رکھنے کے لئے کیا اہتمام کرنا چاہیئے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان عبادات کو بندہ مومن پر لازم کیا ہے اور ان کا التزام لازم قرار دیا ہے تا کہ بندہ مومن اس قابل ہو سکے کہ وہ اپنے مقصد تخلیق کو پورا کر سکے اور واقعی بندگی پر رہ کر زندگی گزارنے کے قابل ہو سکے۔

چنانچہ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جنت میں رہائش عطا کی اور ان سے ایک درخت کے قریب نہ جانے کا عہد لیا۔ لیکن آدم علیہ السلام اس عہد کو قائم نہ رکھ سکے اور اس درخت کو چکھ لیا۔ اس حقیقت کو قرآن مجید میں سورہ طٰہٰ میں یوں بیان فرمایا گیا ہے۔

﴿وَلَقَدۡ عَھِدۡنَا اِلٰی آدَمَ مِنۡ قَبۡلُ فَنَسِیَ وَلَمۡ نَجِدۡ لَہٗ عَزۡمًا O﴾ (طٰہٰ ۱۱۵)

''اور اس سے پہلے ہم آدم کو ایک حکم دے چکے تھے (ایک عہد لے چکے تھے) تو وہ بھول گئے

اور ہم نے اس میں پختگی نہ پائی۔"

اس لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جب دنیا میں بھیجا تو ان پر ارکان اسلام لازم کردیئے تا کہ پھران پر غفلت طاری نہ ہونے پائے۔ چنانچہ نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ ہر امت پر مختلف صورتوں میں اللہ کی طرف سے فرض رہی ہیں کیونکہ یہ انسان کی تربیت کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہتمام ہے تا کہ اللہ کو ماننے والے غفلت سے بچے رہیں۔

نماز کی اصل غرض وغائت یہی ہے کہ وہ انسان کو غفلت سے بچاتی ہے اور اللہ کی یاد تازہ رکھتی ہے چنانچہ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے کہ جب انہیں کوہ طور پر اللہ تعالیٰ نے نبوت سے سرفراز فرمایا تو سب سے پہلا حکم یہی دیا کہ ﴿اِنَّنِیۡٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ﴾ (طٰہٰ ۱۴) (اے موسیٰ) میں ہوں اللہ میرے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں۔ پس تمہیں میری بندگی پر زندگی گزارنا ہے اور نماز کو قائم رکھنا میری یاد کے لئے اور اس طرح سورہ عنکبوت میں رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرکے فرمایا ﴿اُتۡلُ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ ؕ وَلَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ؕ﴾ (العنکبوت:45) جو کتاب آپ پر وحی کی گئی ہے اسے پڑھا کیجئے اور نماز قائم رکھئے بے شک نماز بے حیائی اور منکرات سے روک دیتی ہے اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔

اسی طرح روزہ کا اصل مقصد بھی تقویٰ کا پیدا کرنا ہے اور نفسانی خواہشات بھوک، شہوت اور کمزوری اور تھکان پر کنٹرول حاصل کرنے کا نام ہی تقویٰ ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی نفس پر حاوی نہ ہو جائے۔ بلکہ روح ربانی اتنی قوی ہو جائے کہ نفس کو قابو میں رکھ سکے۔ اس لئے دن کو بھوک اور شہوت پر قابو پایا جائے اور رات کو اللہ کے کلام سے روح کو قوی کیا جائے تا کہ جس مالک کے حکم سے حلال چھوڑ رکھا ہے اس کی یاد تازہ رہے اور کم از کم حرام سے بچنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو روزہ کا حاصل ہیں اس لئے انہی آیات میں یہ بھی آ گیا کہ ﴿وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیۡ عَنِّیۡ فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ اور وَلَا تَاۡکُلُوۡۤا اَمۡوَالَکُمۡ بَیۡنَکُمۡ بِالۡبَاطِلِ "جب روح بیدار ہو اور مالک کی طرف توجہ کرے تو جان لو وہ قریب ہی ہے نفسانی خواہشات کے پردوں کو ہٹاؤ

اور اس سے قرب حاصل کرلو اور دیکھو اصل تقویٰ اللہ کی حرام کی ہوئی صورتوں سے اپنے آپ کو بچانے کا نام ہے۔ (البقرہ ۱۸۸۔۱۸۶)

زکوٰۃ بھی اصل میں تزکیہ نفس کا بہت بڑا ذریعہ ہے کہ روزی حلال ذرائع سے حاصل کرو اور اسے اللہ کی عطا سمجھ کر حقوق کی ادائیگی میں لگاؤ اور اس میں سے سائل ومحروم کا حق نکالو تا کہ اس کی محبت دل میں پیدا نہ ہونے پائے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے اَلصَّدَقَۃُ بُرۡھَانٌ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا دلیل ہے انسان کے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کی۔

حج تو بہت ہی جامع رکن ہے، جس میں مال کا خرچ، نفس کی مشقت کے علاوہ اسلام کی بنیاد پر تمام مسلمانوں کا ایک امت کا فرد ہونے کا احساس اجاگر رکھنے کا بندوبست ہے اور لسانی، قومی، علاقائی، نسلی عصبیتوں سے نکالنے کا ذریعہ ہے۔ گھربار، کاروبار اور دنیاوی مصروفیتوں سے نکلو اور ایک ہی رنگ میں رنگے جاؤ اور اللہ کے حضور پیش ہو جاؤ تا کہ معلوم ہو کہ ہم سب سے پہلے مسلم ہیں اور پھر ہندوستانی، پاکستانی یا ایرانی وعراقی۔ ان تمام آلائشوں سے بندہ مومن کو بچانے کے لئے اور اللہ تعالیٰ سے اس کا تعلق مستقل رکھنے کے لئے یہ عبادات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہر بندہ مومن پر فرض کی ہیں تا کہ وہ اصل تقاضے جو اس سے مطلوب ہیں وہ ادا کرنے کے قابل رہے۔

دوسری چیز ان عبادات/ارکان کے بارے میں ذہن میں رہنی چاہئے کہ یہ دین کے ستون ہیں۔ اگر ستون نہ ہوں تو عمارت کا کوئی تصور نہیں۔ اس لئے آنحضور ﷺ نے فرمایا الصلوٰۃ عِمَادُ الدِّیۡن مَنۡ ھَدَمَھَا ھَدَمَ الدِیۡنَ (مشکوۃ) نماز دین کا ستون ہے جس نے ستون کو گرا دیا اس نے دین کو گرا دیا۔ واقعی حقیقت یہی ہے کہ کوئی بھی عمارت ہو اس کی چھت تو اس کی دیواروں/ستونوں پر ہی کھڑی ہوتی ہے۔ اگر ستون گر جائیں تو عمارت گر جاتی ہے۔

یہ خناس بھی ذہن سے نکال دینا چاہئے کہ پہلے چھت ڈال لی جائے اور پھر ستون بنا لئے جائیں گے۔ جیسے آج کل کچھ حضرات کا یہ مؤقف ہے پہلے اسلام کا نظام ربوبیت قائم کرو اور ارکان اسلام/عبادات کی ہیئت اور حیثیت بعد میں معین کی جائے گی۔

اصل تقاضا کیا ہے؟ وہی جو پوری انسانیت سے کیا گیا ہے اور وہ ہے عبادت رب۔ اپنے

مالک کے غلام بن کر پوری زندگی گزارنا کیونکہ یہ انسان کی غرض تخلیق ہے۔ اب یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ آج کل بعض علماء نے صرف ان ارکان اسلام ہی کو پورا دین اور عبادت قرار دیا ہوا ہے۔ انہیں سوچنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ تو فرمارہے ہیں کہ ہم نے انسان کو پیدا ہی عبادت کے لئے کیا ہے تو کیا انسان کی غرض تخلیق صرف نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی ادائیگی ہی ہے۔ حالانکہ یہ تو صرف غفلت سے بچانے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں اصل مطالبہ تو اللہ تعالیٰ کو دنیا کا مالک مان کر اسکی اطاعت میں دینا ہے۔ اگر کوئی بندہ مومن عبادات کو ادا کرتا ہے اور پھر تمام زندگی کے معمولات اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حدود کے اندر رہ کر گزارتا ہے۔ اپنے معاشرتی، معاشی اور سیاسی فرائض ادا کر کے زندگی گزار رہا ہے اور صرف اپنے جائز حقوق پر اکتفا کرتا ہے، اس کی ساری زندگی عبادت ہے اور یہی مطلوب ہے۔

تیسری ذمہ داری جو عائد کی جارہی ہے وہ ہے خیر اور بھلائی کا اختیار کرنا۔ یہ بھی بندہ مومن کے لئے ضروری ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ تعالیٰ کو اپنے کنبے میں سے وہی پسندیدہ ہے جو اس کی مخلوق کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہے اور ان کی بھلائی اور خیرخواہی کا فکر رکھتا ہے۔ یہ حقیقت ہے جس کو نبی اکرم ﷺ نے اپنے فرمان میں یوں بھی واضح فرمایا ہے: اَلدِّیْنُ اَلنَّصِیْحَۃُ (صحیح بخاری ومسلم) دین تو بس خیرخواہی کا نام ہے اور اس خیرخواہی میں تمام انسانوں کی خیرخواہی شامل ہے۔

یہ انسان کی حمیت اور غیرت حق کا بھی تقاضا ہے کہ انسان جس چیز کو اپنے لئے بہتر سمجھتا ہے اسے دوسروں کے لئے بھی پسند کرے اور اس لحاظ سے سب سے بڑی خیرخواہی یہ ہے کہ انسان کو جہنم سے بچایا جائے اس کیلئے اس کو فقر وفاقہ کی کیفیت سے نکالا جائے تاکہ وہ بھی اللہ سے لولگانے کے قابل ہوسکے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ ﴿الفقرُ کاد یکون کفراً﴾ ''حاجت مندی انسان کو کفر تک لے جاتی ہے۔'' اسلئے اللہ تعالیٰ نے ادارہ خلافت کو لوگوں کی بنیادی ضروریات مہیا کرنے کا ذمہ دار ٹھہرا دیا ہے تاکہ لوگ مایوس ہو کر کفر تک نہ پہنچ جائیں۔

یہ ہیں تین تقاضے/ ذمہ داریاں، فرائض جن کی ادائیگی ہر بندہ مومن سے مطلوب ہے تاکہ وہ

اپنے اللہ کی رضا حاصل کر کے اپنی مراد کو حاصل کرے یعنی آخرت کی سرخروئی حاصل کر سکے۔

یہی پیغام ہے جو اللہ کا ہر نبی اور رسول اپنی اپنی قوم کو دیتا رہا اور یہی ہے جسے نبی اکرم ﷺ کے ماننے والوں کے سامنے اللہ تعالیٰ نے اپنے پہلے خطاب میں واضح فرمادیا تاکہ ہر بندہ مومن جان لے کہ اس کا رب اس سے کیا تقاضا رکھتا ہے جس کی ادائیگی پر اس کی فلاح کا دارومدار ہے۔

اب آیئے دوسری آیت کی طرف اور وہ یوں ہے:

وَجَاھِدُوْ فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ.........

دوسری آیت کے بارے میں بعض باتیں سمجھ لیجئے تاکہ پوری طرح سے حقیقت واضح ہوجائے۔

پہلی آیت میں کامیابی کے لوازمات تو بیان کردیئے گئے اور اب یہ دوسرا حکم کیوں دیا جارہا ہے تو جان لیجئے یہ حکم اس امت کے لئے خاص ہے اور وہ اس وجہ سے کہ اس کے رسول اللہ ﷺ پر اللہ تعالیٰ نے نبوت کو ختم کردیا اور رسالت کو دائمی بنادیا۔

اللہ تعالیٰ نے نبوت ورسالت کا جو سلسلہ جاری فرمایا تو یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت وفضل کا ظہور ہے تمام انسانیت کے لئے۔ اس مرتبہ ومقام کے دو پہلو ہیں۔ ایک ہے نبوت کا پہلو اور دوسرا رسالت۔

نبوت

نبوت کی اصل غرض وغایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام کو وصول کرنے کی صلاحیت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ فرمایا تھا کہ میری طرف سے ہدایت آتی رہے گی۔ اس کی صورت یہ اختیار کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے ان انسانوں کو چنا جن میں اللہ کے کلام کو وصول کرنے کی صلاحیت تھی۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ اصطفٰی اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰھِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ﴾

(آل عمران : ۳۳)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے چن لیا حضرت آدمؑ، نوحؑ آل ابراہیمؑ اور آل عمران کو تمام

جہانوں میں سے۔''

یہ ہیں اللہ تعالیٰ کے انبیاء جو ہدایت کو وصول کرتے رہے۔ان میں سے کچھ وہ تھے جن کو پھر اللہ تعالیٰ نے بعض قوموں کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ ہر نبی چونکہ اللہ کا بندہ اور انسان تھا اس لئے یہ پیغام اس کے لئے بھی تھا۔ یہ ہدایت کا سلسلہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے شروع کیا تھا اور پھر وقتاً فوقتاً جاری رہا یہاں تک کہ نبی آخرالزمان حضرت محمد ﷺ پر اس ہدایت کو کامل کر دیا۔ایک مکمل ضابطہ حیات دے دیا گیا۔اور پھر اس ہدایت کو رہتی دنیا کے لئے محفوظ فرما دیا۔ اس پر یہ سلسلہ ختم ہو گیا کیونکہ اب مزید ہدایت کا نازل کرنا مطلوب نہ تھا۔اس لئے نبی اکرم ﷺ آخری نبی قرار پائے۔ یہ ہے اصل محمد المصطفیٰ حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری چنیدہ انسان جن کو نبی کے طور پر اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا اور ان کو اپنے آخری کلام سے نوازا۔

﴿الیوم اکملتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً﴾ (المائدہ:۳)

آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت پوری کر دی ہے اور تمہارے لئے اسلام کو بطور ضابطہ حیات پسند کر لیا ہے۔اب اگر کوئی انسان یہ مانتا ہے کہ قرآن مجید الہدیٰ ہے اور وہ اسی طرح آج بھی محفوظ ہے جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تو اس کے پاس نبوت کے لئے جواز نہیں ہے۔

رسالت

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ ان انبیاء میں سے بعض کو اللہ تعالیٰ نے رسالت کے منصب پر بھی فائز کیا اور مختلف اوقات میں مختلف قوموں کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ان کی ذمہ داری یہ قرار پائی کہ وہ خود جس ہدایت پر ایمان لائے ہیں اور جس پر عمل پیرا ہیں اسے اپنی قوم تک بھی پہنچائیں تا کہ انسانوں کے پاس قیامت کے دن کوئی عذر نہ رہ جائے اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرنے کے لئے کہ وہ کیوں اللہ کی بندگی نہ کر پائے۔ چنانچہ ہر رسول اس اعلان اور دعویٰ کے ساتھ ہدایت پہنچاتے رہے۔

﴿أَنَا اَوَّلُ الْمُؤمِنِیْنَ ______ اَنَّا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾

''میں پہلا مومن ہوں اور پہلا اس پر عمل کرنے والا ہوں۔''

﴿رُسلاً مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌ بَعْدَ لرُّسُلِ وَکَانَ اللّٰہِ عَزِیْزًا حَکِیْمًا o﴾ (النساء : 165)

''رسول بھیجے گئے مبشر اور منذر بنا کر تا کہ انسانوں کے پاس کوئی عذر نہ رہ جائے اللہ کی جناب میں پیش کرنے کے لئے' اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا۔'' نبی اکرم ﷺ سے پہلے جتنے بھی رسول مبعوث ہوئے ہیں وہ اپنے اپنے زمانے میں خاص لوگوں کی طرف بھیجے گئے تھے اس لئے ان کو وہ کتب عطا کی گئیں جو اسی زمانے کے لئے تھیں اور انہیں لوگوں کے لئے ہدایت تھیں۔اس لئے ہر رسول بنفس نفیس اس پیغام پر عمل کر کے بھی دکھا دیتے تھے اور قوم تک بھی پہنچا دیتے تھے اور حجت قائم کر دیتے تھے۔انہیں معنوں میں ہر رسول اپنی قوم کے لئے شاہد بنے جو اس دنیا میں شہادت کا فریضہ ادا کرتے رہے اور قیامت کے دن اپنی اپنی قوم/امت پر گواہ ہوں گے۔

﴿فَکَیْفَ اِذَا جِئْنَا منْ کُلِّ اُمَّۃٍ بِشَہِیْدٍ وَجِئْنَا بِکَ عَلٰی ھٰؤُلَاءِ شَہِیْدًا ط﴾

(النساء:44)

کیسا سماں ہوگا (قیامت کے دن) جب ہم ہر امت پر ایک گواہ کھڑا کریں گے اور آپ کو اے رسول ان پر گواہ لائیں گے۔ یہی مضمون ہے جو سورہ الاعراف کے شروع میں دہرایا گیا ہے۔﴿وَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِیْنَ اُرْسِلَ اِلَیْھِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِیْنَ﴾ اور ہم لازماً پوچھیں گے ان سے جن کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور ان سے بھی جنہیں رسول بنا کر بھیجا۔یعنی یہی گواہی ہے جو رسولوں سے لی جائے گی کہ انہوں نے اللہ کا پیغام امت تک پہنچا دیا تھا اور جب وہ گواہی دے دیں گے تو پھر امت جواب دہ ہوگی اس پر عمل کی اور یہ ہے وہ قطع عذر جس کے لئے اللہ تعالیٰ رسولوں کو مبعوث فرماتے رہے ہیں جس کا ذکر اوپر آیا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا معاملہ خصوصیت کا حامل ہے کیونکہ ان کو جو ہدایت دی گئی وہ نہ صرف الہدیٰ ہے بلکہ دائمی، جامع، ہمہ گیر، آفاقی اور دوامی بھی ہے۔ وہ صرف اس زمانے کے لئے نہیں

بلکہ رہتی دنیا تک کے لئے ہے۔اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا ذمہ بھی لے لیا۔اب اس ہدایت کو بنی نوع انسان تک پہنچانے کی ذمہ داری کے لئے اب جو انتظام اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لئے پسند فرمایا یہ ہے کہ آپؐ کے ذریعہ وہ پیغام ایک امت تک پہنچا دیا اور پھر اس امت کے ذمہ لگایا کہ وہ اپنے اپنے دور کے لوگوں تک پہنچائے اور اس ذمہ داری کے لئے فرمایا:

﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ﴾

کہ اے امت مسلمہ اب تمہیں اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے جیسے جہاد کا حق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں منتخب کرلیا ہے(Slect) کرلیا ہے اور یہی وہ لفظ ہے جو منصب رسالتؐ کے لئے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے لئے پسند فرمایا اور آپ کو احمد المجتبیٰ بنایا اور یہی نام ہے جو پہلی کتابوں میں آپؐ کے لئے آیا ہے۔کیونکہ فریضہ رسالتؐ ہے جس کا حق واقعی انسانی جدوجہد کے ذریعہ آپؐ نے ادا کیا اور امت کے لئے نمونہ چھوڑا۔

چنانچہ ختم نبوت کی خلعتِ فاخرہ آپ کے سر سجی اور تکمیل رسالت کی ذمہ داری آپؐ کی اُمت کو تفویض ہوئی۔

مقام وفضیلت امت

جان لیجئے یہ فریضہ شہادت ہی ہے جس کی ذمہ داری اس امت پر ڈالی گئی اور اس ذمہ داری کی وجہ سے انہیں بھی مجتبیٰ کہا گیا اور یہی سبب ہے جس کے لئے اسے امت وسط کے منصب کا حقدار ٹھہرایا گیا۔

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (البقرہ۱۴۳)

’’اور اسی لئے ہم نے تمہیں امت وسط بنایا ہے تا کہ تم گواہ بن جاؤ انسانوں پر جیسے رسول گواہ بنے تم پر‘‘

وسط کیا ہے؟ اصل میں یہ امت اللہ تعالیٰ کے سلسلہ پیغام رسانی کی زنجیر کی ایک کڑی قرار پا گئی۔اللہ کا پیغام انسانوں تک پہنچانے کے لئے پہلے یہ سلسلہ مکمل ہوجاتا تھا اس طرح کہ اللہ کا

پیغام لاتا تھا رسول ملک یعنی فرشتہ رسول الناس تک اور وہ پہنچا دیتا تھا اپنی قوم تک لیکن نبی اکرم ﷺ پر آ کر یہ روایت تبدیل کردی گئی اب یہ کام اس اُمت نے کرنا ہے، گویا قیامت تک کرنے والے تمام انسانوں کے لئے یہی اُمت ’’واسطہ ہدایت‘‘ اور ’’ذریعہ نجات‘‘ ہے۔اور یہی اس کا مقام فضیلت ہے کہ جسکی بنا پر پہلے رسول بھی اس امت میں ہونے کی خواہش کرتے رہے اور اس ذمہ داری کی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو جو یہ کام سرانجام دیں گے اپنا بھائی قرار دیا ہے۔

آپؐ نے فرمایا:

يٰلَيْتَنِيْ لَقِيْتُ اِخْوَانِيْ قَالُوْا اَلَسْنَا اِخْوَانَكَ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ قَوْمٌ يَّجِيْئُوْنَ بَعْدَكُمْ يُؤْمِنُوْنَ بِيْ اِيْمَانَكُمْ وَيُصَدِّقُوْنِيْ تَصْدِيْقَكُمْ وَيَنْصُرُوْنِيْ نَصْرَكُمْ فَيٰلَيْتَنِيْ لَقِيْتُ اِخْوَانِيْ (ابن ابی شیبہ فی مسندہ)

’’حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کاش میری ملاقات ہو اپنے بھائیوں سے۔صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کی کیا ہم آپؐ کے بھائی نہیں ہیں۔آپؐ نے فرمایا کیوں نہیں لیکن میری مراد ان سے ہے جو تمہارے بعد آئیں گے۔وہ مجھ پر ایمان لائیں گے جیسے تم ایمان لائے ہو۔وہ میری تصدیق کریں گے جیسے تم نے کی ہے اور وہ میری مدد کریں گے جیسے تم کر رہے ہو۔پس کاش میری ملاقات ہو اپنے بھائیوں سے۔‘‘

کیسا خوشی کا مقام ہے اس شخص کے لئے جو ایمان رکھتا ہو اور پھر رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرے کہ وہ واقعی اللہ کے آخری رسول ہیں جن کو تمام انسانیت کے لئے بھیجا گیا ہے اور پھر ان کے مشن میں ان کا مددگار بنے اور مرتبہ اخوت حاصل کرے اور اسی طرح کا وہ فرمان ہے جو امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں نقل کیا ہے کہ:

سَئَلَ اَصْحَابُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم هَلْ مِنْ قَوْمٍ اَعْظَمُ مِنَّا اَجْرًا اٰمَنَّا بِكَ وَاتَّبَعْنَاكَ قَالَ بَلْ قَوْمٌ يَاتُوْنَ بَعْدَكُمْ يَاْتِيْهِمْ كِتَابُ اللّٰهِ بَيْنَ لَوْحَيْنِ فَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَعْمَلُوْنَ بِمَا فِيْهِ اُولٰئِكَ اَعْظَمُ مِنْكُمْ اَجْرًا

”اصحاب رسول ﷺ نے عرض کی کیا ہم سے بھی کوئی اجر میں بڑا ہوگا۔ ہم وہ ہیں جو آپؐ پر ایمان لائے ہیں اور آپؐ کی پیروی کر رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ہاں، وہ لوگ جو تمہارے بعد آئیں گے (جنہوں نے نہ مجھے دیکھا ہوگا اور نہ ہی تم لوگوں کو) انکے پاس اللہ کی کتاب دو گتوں کے درمیان پہنچے گی تو وہ اس حال میں بھی مجھ پر ایمان لائیں گے اور جو اس کتاب میں ہوگا، اس پر عمل کریں گے۔ وہ تم لوگوں سے اجر میں بڑھ کر ہوں گے۔“

لیکن یہ فضیلت اور اجر اس ذمہ داری کی بنیاد پر ہے جو آگے بیان ہوئی ہے اور وہ یہ ہے:

لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ

”تاکہ جیسے ہمارے رسول تم پر دین کی گواہی دے رہے ہیں ویسے تم باقی لوگوں کے لئے گواہ بن جاؤ۔“

وگرنہ کسی امتی کے گھر پیدا ہو جانے سے یہ فضیلت نہیں ملتی بلکہ ذمہ داری کی امکانی ادائیگی کی وجہ سے فضیلت ملتی ہے جو قرار دی گئی نبی اکرم ﷺ کے مشن میں ان کی مدد۔ کیونکہ کسی اُمت میں پیدا ہونا کسی کے اختیار سے نہیں ہے کہ اس کو جواز بنا لیا جائے اپنی عظمت کا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے جہاں چاہا کسی کو پیدا کیا ہے۔ اُمتی کی عظمت تو اس میں ہے کہ وہ ذمہ داری جو اس پر عائد کی گئی ہے اُمتی ہونے کے ناطے سے وہ ادا کرے ورنہ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم روزِ محشر ان کو اُمتی ہی نہ مانیں جنہوں نے ذمہ داری ادا نہ کی ہو۔ کیونکہ اصل میں تو یہ فریضہ آپ کا ہے جو آپؐ امتیوں پر عائد کر کے گئے ہیں۔

یاد کیجئے حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ کے خطابات اس فریضہ شہادت کے لئے جو آپؐ امت کے سپرد کر کے گئے ہیں جب کہ کوئی سوا لاکھ کے مجمع سے آپؐ نے دریافت فرمایا۔

أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ

”لوگو! آگاہ ہو جاؤ کیا میں نے اللہ کے دین اور اللہ کے پیغام ہدایت کو آپ لوگوں تک پہنچا دیا ہے“، تو لوگوں نے بیک زبان جواب دیا۔

نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ (رواہ مسلم)

”ہم گواہ ہیں کہ آپؐ نے پہنچا بھی دیا، حق امانت بھی ادا کر دیا۔ امت کی خیر خواہی کا حق بھی پورا کر دیا۔“ اس پر سید المرسلینؐ نے فرمایا تو اب آپ لوگوں کو یہ امانت سونپی جا رہی ہے اور اب تمہیں امتی ہونے کا حق ادا کرنا ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے تمہیں پسند فرمایا ہے اور فرمایا:

فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الغَائِبَ (متفق علیہ)

”پس جو گواہی دے رہا ہے وہ ان تک پہنچائے جن تک نہیں پہنچا“ اور پھر اس میں ایسی عمومیت پیدا کی کہ ہر امتی یہ جان لے کہ یہ فریضہ ادا کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔

چنانچہ فرمایا:

بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً

”پہنچاؤ میری جانب سے (on my behalf) خواہ ایک ہی آیت تم تک پہنچ پائی ہو۔“

یہ ہے جو ہر اُمتی کو جان لینا چاہیئے کہ یہ ذمہ داری صرف علماء کی نہیں ہے۔ بلکہ جو بھی فضیلت حاصل کرنے کا متمنی ہے اسے یہ ذمہ داری بھی ادا کرنی چاہیئے۔ یہ نہیں ہے کہ ہم تو بنیں ڈاکٹر، انجینئر، سائنسدان اور سرمایہ دار اور یہ ذمہ داری ہماری طرف سے ادا کریں مولوی حضرات، کیونکہ ان کو ہم اس ذمہ داری کے عوض چندے دیتے ہیں۔ جان لیجئے یہ کارِ رسالت پوری اُمت کا اجتماعی فریضہ ہے۔ اس سے عہدہ برآ اسی طریقے پر ہوا جا سکتا ہے جیسے کہ صحابہؓ نے کیا۔ وہ اپنی روزی بھی خود کماتے تھے اور یہ فریضہ بھی ادا کرتے تھے اور یہی ہے جو ہر رسول سے بھی کہلوایا گیا۔ (لَا أَسْئَلُ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ) میں اس کام کی اُجرت تم سے نہیں مانگتا۔ علماء حضرات کو بھی جان لینا چاہیئے کہ درس و تدریس پر تو اجرت لی جا سکتی ہے لیکن تبلیغ دین پر اُجرت کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ یہ اُسوہ رُسل کے خلاف ہے۔

اللہ کے رسولوں نے حجت کیسے قائم کی

اب سوچنے کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کیسے اپنے رسولوں کے ذریعہ حجت قائم کرتا رہا ہے اور ان کو کونسی چیز دے کر بھیجتا رہا ہے کہ جس کی گواہی دے کر وہ قطع عذر کرتے تھے۔

سب سے پہلے تو جان لیجئے کہ تمام رسولوں کے بارے میں ارشاد ربانی ہے۔

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (الحدید:25)

’’بے شک اللہ تعالیٰ بھیجتا رہا ہے اپنے رسولوں کو بینات دیکر اور نازل کرتا رہا ہے ان کے ساتھ کتاب اور میزان تا کہ لوگ عدل اجتماعی پر قائم رہیں۔‘‘

اس آیت مبارکہ میں تین حقائق بیان ہوئے ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی رہنمائی کا حق بھی ادا کرتا رہا ہے اور حجت بھی قائم کرتا رہا ہے۔

سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس رسول کو بھی کسی قوم/امت کی طرف بھیجا ہے تو ایسی نشانیاں دے کر بھیجا ہے کہ وہ قوم اور امت اچھی طرح جان لیتی تھی کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ظاہر ہے اگر قوم پہچانے ہی نہ تو حجت کیسے قائم ہوگی۔اس لئے اللہ تعالیٰ ایسے معجزات دے کر اپنے رسولوں کو بھیجتا تھا کہ وہ جان لیتے تھے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔آپ پوچھیں گے کہ پھر وہ مانتے کیوں نہیں رہے تو جان لیجئے ماننے میں اصل تو رکاوٹ رہی ہے انسان کی باطل نظام میں وہ حیثیت جو انہوں نے حاصل کی ہوتی ہے یا مالی مفادات جو اس باطل نظام کے تحت انہیں حاصل ہوتے ہیں اور ان کا زعم کہ اصل دانش اور بینش کے تو وہی حامل ہیں اور قوم کے اصل خیر خواہ ہیں۔

حالانکہ وہ قوم کے تمام وسائل پر مسلط ہوتے ہیں اور بدمعاشی کر رہے ہوتے ہیں۔جیسے آج بھی آپ اسلام کی دعوت دیں تو سب سے پہلے یہی لوگ آپ کو بتائیں گے کہ وہ ہی اصل عقلمند اور قوم کی ترقی کے گر جاننے والے ہیں۔یہ بنیاد پرست تو قوم کو پیچھے لے جانا چاہتے ہیں اور ان کے نظریات بڑے سطحی ہیں۔

وگرنہ کیا خیال ہے فرعون کو معلوم نہ ہوا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے فرستادہ ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا جیسے قرآن مجید میں واضح کیا گیا ہے:

﴿قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا اَنْزَلَ هٰؤُلَاۗءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَاۗئِرَ﴾

(بنی اسرائیل:102)

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے فرعون! تو اچھی طرح جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نشانیاں نازل کی ہیں وہ تیرے لئے بصیرت کا سامان رکھتی ہیں اصل مالک ارض وسماء کی طرف سے اور فرمایا:

﴿فَلَمَّا جَاۗءَتْهُمْ اٰیٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ○ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَیْقَنَتْهَاۗ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا﴾ (النمل:۱۴)

’’جب ان کے پاس ہماری ایسی نشانیاں آئیں جو روز روشن کی طرح تھیں تو انہوں نے کہہ دیا یہ تو کھلا جادو ہے اور انکار کیا ان نشانیوں کا ظلم اور سرکشی کرتے ہوئے حالانکہ ان کے دل خوب یقین حاصل کر چکے تھے۔‘‘

کیا خیال ہے اس امت کا فرعون یعنی ابوجہل کیا حضرت محمد ﷺ کی صداقت کو نہیں جانتا تھا‘ کیوں نہیں۔اللہ تعالیٰ تو اپنے رسولوں کو ایسے معجزات دے کر بھیجتا ہے اور ان کا کردار ایسا بے مثال ہوتا ہے کہ وہ لوگ پہچان لیں وگرنہ حجت قائم نہیں ہوتی۔چنانچہ ابوجہل سے کسی نے پوچھا کیا تم جانتے نہیں کہ محمد ﷺ سچے ہیں تو اس نے جواب دیا اللہ کی قسم انہوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا تو پوچھنے والے نے سوال کر دیا کہ پھر تم ان کو مانتے کیوں نہیں۔اس پر اس نے حق بیان کر دیا کہ اصل معاملہ یہ ہے کہ ہمارے اور بنو ہاشم کے درمیان شریکہ چلا آ رہا ہے اور ہم ان کے مدمقابل ہیں۔اب اگر آج ان کے نبی کو مان لوں تو ان کے نیچے لگنا پڑتا ہے اور یہ مجھے منظور نہیں ہے۔

جان لیجئے یہی صاحب اقتدار‘ جاگیردار‘ سرمایہ دار اور دنیا دار کی سب سے بڑی انانیت ہوتی ہے جو حق کو قبول کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے اور آج بھی یہی ہے جو پاکستان کے اقتدار پر براجمان جاگیردار‘ بیوروکریٹ اور فوجی جرنیلوں کا روگ ہے کہ وہ دین کو اختیار نہیں کر رہے کہ ان کو اس باطل نظام میں جو حیثیت ملی ہوئی ہے اور استحقاق حاصل ہیں ان کو چھوڑنا پڑتا ہے۔اس لئے وہ اپنے باطل نظریے اور اپنی بہتری اور دنیا کے ساتھ موافقت رکھنے والے ثقافت کے ختم ہونے کا رونا روتے ہیں اور اہل دین کو کم عقل‘ قدامت پرست‘ بنیاد پرست کہہ کر ترقی کی راہ میں رکاوٹ قرار دیتے ہیں کیونکہ اگر وہ اسلامی عدل وقسط کے نظام کو رائج کریں تو ان کا یہ مقام نہیں رہتا۔ان کی عیاشیوں‘ فحاشیوں اور اباحیت پرستی پر زد پڑتی ہے اور ان کی دنیا کی زندگی برباد ہوتی ہے اور ان

کے نزدیک اصل زندگی تو دنیا ہی کی زندگی ہے۔ آخرت کس نے دیکھی ہے اور ویسے بھی وہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے ہیں اس لئے جنت تو ان کا پیدائشی حق ہے ہی۔ اس لئے اپنی دنیا ان دین داروں کے کہنے پر کیوں برباد کریں۔ یہی کہتے رہے ہیں اپنے اپنے وقت کے فرعون، ہامان، نمرود، شداد اور مترفین۔ ذرا قرآن مجید میں بیان کردہ حقائق کو تو دیکھیں تو سمجھ آجائے گی۔

قوم نوح علیہ السلام نے کیا کہا تھا ان کی دعوت کے جواب میں:

﴿فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ o﴾ (ہود:27)

" کہنے لگے سردار (حکمران طبقہ) جو اس قوم کے کافر تھے کہ ہم آپ کو اپنے جیسا انسان دیکھتے ہیں اور آپ کے ساتھی ہمارے معاشرے کے گرے پڑے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور بڑی سطحی رائے کے حامل ہیں۔ تمہارے پاس کوئی جاگیر بھی نہیں ہے بلکہ ہم آپ کو جھوٹا گردانتے ہیں۔" اور کہا تھا قوم فرعون کے سرداروں اور جادوگروں نے

﴿قَالُوْا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى o﴾ (طٰہٰ:63)

﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ وَاَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ o﴾ (المومن:25)

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام (اور حضرت ہارونؑ) کی دعوت کے نتیجے میں یہ جواب دیا گیا۔ کہنے لگے یہ دو جادوگر ہیں، یہ چاہتے ہیں کہ جادو کے زور پر تمہیں تمہاری زمین سے نکال دیں۔ تمہارے مثالی کلچر کو ختم کر دیں اور فرعون کہنے لگا۔ مجھے اجازت دو میں موسیٰؑ کو قتل کر دوں اور وہ پکارے اپنے رب کو۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ تمہارے نظام کو بدل دے گا اور زمین میں فساد برپا کر دے گا اور یہی ہے جسے عمومی طور پر تمام رسولوں کے بارے میں فرمایا گیا۔

﴿وَمَا اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ

كٰفِرُوْنَ o وَقَالُوْا نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ o﴾

اور ہم نے جب بھی کسی بستی کی طرف رسول بھیجا تو اس بستی کے خوشحال لوگوں نے کہا (جن کے پاس اقتدار اور مادی وسائل ہوتے ہیں) کہ ہم انکار کرتے ہیں اس کا جو آپ لوگوں کو دے کر بھیجا گیا ہے اور ہم زیادہ ہیں مال اور اولاد میں (یعنی یہ دلیل ہے ہماری شرافت اور بلند مرتبہ ہونے کی) اور ہم کو عذاب نہیں دیا جائے گا۔ (کیونکہ اس دنیا میں ہماری کسی خوبی کی وجہ سے ہمیں نوازا گیا ہے اور یہی کافی ہے آخرت کی کامیابی کیلئے بھی)۔

اس کیفیت کو نبی اکرم ﷺ نے واضح فرمایا اپنے فرمان میں۔

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ فَقَالَ رَجُلٌ اِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ اَنْ يَّكُوْنَ ثَوْبُهٗ حَسَنًا وَنَعْلُهٗ حَسَنَةً قَالَ اِنَّ اللّٰهَ جَمِيْلٌ وَيُحِبُّ الْجَمَالَ. اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ. (رواہ مسلم)

"جنت میں وہ شخص داخل نہ ہوگا جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر تکبر ہوا۔ اس پر ایک صحابیؓ نے پوچھا اے اللہ کے رسول ایک شخص چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں اور اس کا جوتا خوبصورت ہو۔ تو کیا یہ تکبر ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہرگز نہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ جمیل ہے اور وہ خوبصورتی کو پسند فرماتے ہیں۔ تکبر یہ ہے کہ انسان حق سامنے آنے پر اس کو جھٹلا دے اور انسانوں کو حقیر سمجھے۔"

تو جان لیجئے اللہ تعالیٰ ہر رسول کو ایسی نشانیاں دے کر بھیجتا رہا ہے تاکہ وہ لوگ پہچان لیں جن کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔ اور ان پر حجت قائم ہو جائے۔ اب بھی حق بالکل واضح ہے اور اللہ کی کتاب کی صورت میں اسی طرح محفوظ ہے جیسے رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ لیکن اگر آج لوگ نہیں مانتے تو لاعلمی کی بنیاد پر نہیں بلکہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے انکار کرتے ہیں اور ان کی انانیت ہی آڑے آتی ہے اور رسول خدا کے اُسوہ کو قبول کرنے اور عام انسان کی سطح پر زندگی گزارنے سے بچنے کے لئے عذر تراشتے ہیں۔

ہاں ایک حقیقت کا ازالہ بھی ضروری ہے کہ باطل نظام میں مذہبی طبقہ بھی حق کی مخالفت میں صاحب حیثیت لوگوں کو ڈھال مہیا کرتا ہے۔ جیسے علماء دین کی اکثریت اسلام کو بس مذہب کی حیثیت میں پیش فرمارہی ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے ہی کا درس دے رہی ہے اور باطل نظام سے کشمکش اور اس کے خلاف جہاد سے گریزاں ہے بلکہ بعض معاملات میں ان کے سپورٹر ہیں۔ جیسے بنک انٹرسٹ، جاگیرداری، مذہبی اجارہ داری وغیرہ اور یہی اکثریت ان علماء حقانی کے اثرات کو زائل کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے کہ عوام اسلام کے مذہبی پہلو یعنی عقیدہ، عبادات اور رسومات کی حد تک عمل کر کے بڑے مطمئن ہیں۔ حالانکہ اوپر طاغوت کا نظام ہے اور باطل پوری طرح چھایا ہوا ہے لیکن ان کا سارا زور آپس کے مذہبی اختلافات کو ہوا دینے پر خرچ ہو رہا ہے۔ یہی حقیقت ہے جسے کسی نے ایک شعر میں سمو دیا ہے۔ ؎

باطل کے اقتدار میں تقویٰ کی آرزو
کیسا حسین فریب ہے جو کھا رہے ہیں ہم

پوری قومی زندگی انسانوں کی حاکمیت، سودی نظام اور اباحیت پرستی اور فحاشی پر مبنی ثقافت پر چل رہی ہے اور یہ صرف انفرادی معاملات کی بنیاد پر تقویٰ کی منزلیں سر کر رہے ہیں اور اس نظام کو بدلنے کی جدوجہد کے لئے کوئی فکر نہیں ہے بلکہ اگر فکر ہے تو صرف اپنے مدرسوں اور مساجد کی۔ ان کی مساجد میں اگر اسلام کے بارے میں بات کی اجازت مانگی جائے تو سب سے پہلے سوال ہوتا ہے آپ کا مسلک کیا ہے۔ کیونکہ دین اسلام سے خود ہی دست بردار ہو چکے ہیں۔ اس لئے اصل بات مسلک ہے۔

اب آیئے اس بات کی طرف کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو کیا دے کر بھیجتا رہا ہے جس کی شہادت کا فریضہ وہ ادا کرتے رہے ہیں۔ تو فرمایا گیا کہ

﴿وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ (الحدید:25)

''اور ہم نازل کرتے ہیں کتاب اور میزان تاکہ لوگوں میں عدل اجتماعی قائم ہو۔''

اور یہی دو چیزیں ہیں جن کے بارے میں سورۃ الشوریٰ (آیت 17) میں نبی اکرم ﷺ کے بارے میں ذکر کیا گیا:

﴿اَللّٰهُ الَّذِىْ اَنْزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَان﴾

اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے کہ جس نے کتاب نازل کی حق پر مبنی اور میزان۔ یہ ہے دوسری حجت جو اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کے ذریعہ کرواتا رہا ہے کہ وہ کتاب کی تعلیم پر مبنی عدل اجتماعی قائم کریں اور اس کتاب کی دعوت کو تمام انسانوں تک پہنچائیں جن کی طرف انہیں رسول بنا کر بھیجا جاتا رہا ہے۔

اور انہی دو چیزوں کو بیان کیا آپؐ کے لئے۔ تین مقامات پر اس صورت میں جو تقاضا ہوا تکمیل دین اور اتمام نعمت کا۔

﴿هُوَ الَّذِىْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾

(الصّف 9، الفتح 28، التوبہ 33)

وہ ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (ﷺ) کو الہدیٰ اور دین الحق دے کر تاکہ وہ غالب کریں اس دین کو باقی تمام ادیان یا پورے کے پورے دین پر۔ یعنی پہلے رسولوں کے بارے میں جو ذکر ہے کتاب اور میزان کا اور مکی قرآن میں جس کا ذکر کیا آپؐ کے لئے بھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو الہدیٰ اور دین الحق بنا دیا۔ آخری رسول اللہ ﷺ کے لئے کتاب کی جگہ الہدیٰ کامل ترین ہدایت اور میزان کی جگہ دین الحق یعنی دین اسلام۔

اب جاننا ہے کہ جو شہادت کا فریضہ ذمہ داری تھی رسول اللہؐ کی اور پھر ذمہ داری ٹھہرائی گئی خیرِ امت کی جیسے فرمایا

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (البقرہ :143)

اس کے تقاضے کیا تھے اور اور آپؐ نے کیسے ادا کئے اور اب امت کیسے ادا کرے گی تو شہادت کا فریضہ ادا ہو جائے گا۔

الہدیٰ کی شہادت

اللہ کی کتاب ایک پیغام لے کر آئی ہے اور وہی اس کی دعوت ہے۔ پوری انسانیت کی طرف اور وہ ہے دعوتِ ایمان۔ اس کائنات کے حقائق کو تسلیم کرنے کا نام ایمان ہے۔ یعنی یہ مانو! کہ یہ کائنات خود بخود پیدا نہیں ہوئی اور نہ ہی خود بخود چل رہی ہے بلکہ ایک ہستی ہے جس نے اسے پیدا کیا ہے اور وہی اب بھی اس کا حاکم حقیقی ہے۔ جیسے فرمایا:

﴿اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ o﴾ (الزمر:62)

"اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو وجود بخشا ہے اور وہی سب چیزوں کا کارساز ہے"۔

یہ کائنات اور دنیا نہ ہمیشہ سے ہے اور نہ ہی ہمیشہ رہنے والی ہے بلکہ یہ ایک مدت معین تک کیلئے ہے اور یہ بامقصد تخلیق ہے۔ اس لئے وہ دن آ کر رہے گا جس میں ہر چیز کی غرض تخلیق کا جائزہ لیا جائے کہ اس نے اپنا مقصد پورا کیا یا نہیں کیونکہ یہ بالحق پیدا کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ ہر مخلوق کو فطری صلاحیتیں اور رہنمائی عطا کی ہے جس کی بنیاد پر وہ مسئول ہے اور خاص کر انسان کو تو احسن تقویم پر پیدا کیا گیا ہے۔ اس لئے وہ دن آ کر رہے گا جس دن یہ جانچا جائے گا کہ کس نے اس مقصد تخلیق کو پورا کیا۔ یہ ہے دعوت اس الہدیٰ کی۔ چنانچہ اصل اساساتِ مسئولیت یہ ہیں۔ عہد الست، علم الاسماء، سماعت، بصارت اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور پھر نیکی بدی کی تمیز، حق اور باطل کی پہچان۔

1- ﴿وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ o اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾

"یاد کرو جب تیرے رب نے آدم کی تمام اولاد کو اپنے سامنے حاضر کیا اور ان کو خود ان کے نفس پر گواہ ٹھہرایا اور پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں۔ سب نے اقرار کیا کیوں

نہیں ہم گواہ ہیں"۔ یہ اس لئے کیا کہ مبادا تم قیامت کے دن کہہ دو کہ ہم اس سے غافل تھے۔ یا یہ نہ کہہ دو کہ ہمارے باپ دادا مشرک تھے اور ہم ان کی اولاد تھے اس لئے ان کے بعد (مشرک ہو گئے) تو کیا ہمیں ہلاکت میں ڈالے گا ان باطل کرنے والوں کی وجہ سے"۔ (الاعراف:172`173)

یہ ہے وہ عہد جو ہماری فطرت بنا دیا گیا ہے۔ (اسکی تفصیل عبادات رب میں آ گئی ہے)۔

2- عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاۗءَ كُلَّهَا ہر آدم میں یہ صلاحیت پیدا کر دی کہ زمین پر جتنی چیزیں ہیں انکی خاصیتیں جان لے اور ان سے فائدہ اٹھائے اور کام میں لائے اور ان کو پیدا کرنیوالے کا احسان مانے اور شکر بجالائے۔ (البقرہ) یہ ہے جس سے تمام سائنسی علوم اور عمرانی علوم وجود میں آ رہے ہیں۔

3- هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (الملک:23) وہ ہے (اللہ) جس نے تم کو پیدا کیا اور پھر تمہیں سماعت بصارت اور سوچنے کی صلاحیت سے نوازا۔ بہت تھوڑا ہے جو شکر بجالاتے ہو۔

4- فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (الشمس:8) الہام کر دیا اسکی نافرمانی اور تقویٰ اسکے نفس میں۔ وہ خوب جانتا ہے نیکی کیا ہے، بُرائی کیا ہے؟ اور میرا کیا نہیں ہے۔ یہ ہیں ہر انسان کو ودیعت کی ہوئی بنیادیں جو مسئولیت کے لئے ہیں۔

اس لئے فرمایا وہ قیامت کا دن، یوم الآخر تو لازم ہے کیونکہ وہ تیرے رب کی رحمت کا ظہور ہے تا کہ وہ ان انسانوں کو نوازے جنہوں نے اپنا مقصد تخلیق پورا کیا ہو۔

﴿كَتَبَ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ (الانعام:12)

اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے رحمت کو لازم کر لیا ہے اس لئے وہ تمہیں ضرور جمع کرے گا۔ قیامت کے دن جس کے بارے میں کوئی شک ہے ہی نہیں۔

انبیاء و رُسل کے ذریعے تو انسانوں پر حجت قائم کر دی گئی۔ ہدایت نازل کر کے اور اس پر عمل

کروا کر۔ چنانچہ یہ دعوت دی جاتی رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کتب نازل کرتا رہا ہے وہ اس کا کلام ہے جسے وہ روح الامین کے ذریعے انسانوں میں سے چنیدہ انسانوں تک پہنچاتا رہا ہے اور وہ انسان جو انبیاء ورسل ہیں وہ عمل کر کے دکھاتے رہے ہیں اور اُمت کے لئے اُسوہ حسنہ بنتے رہے ہیں۔

چنانچہ یہ ہے وہ پیغام جو الہدیٰ کے ذریعہ نازل کیا گیا اور اس کی تبلیغ، دعوت اور اخلاقِ حسنہ کے ذریعہ اس کا نمونہ دیا تمام انبیاء اور رسل نے اور خاص کر محمد رسول اللہ ﷺ نے۔

اب اُمت پر اس کی شہادت کے یہی تقاضے ہیں کہ امت اپنے دور کے انسانوں تک سب سے پہلے اس کا پیغام پہنچائے، اسی کا نام تبلیغ ہے۔ چنانچہ پہلا حق الہدیٰ کا یہی ہے۔ لیکن یہ حق اب یوں ادا ہوگا کہ یہ پیغام تمام قوموں تک ان کی زبان میں پہنچایا جائے اور اس کے لئے تمام ذرائع ابلاغ استعمال کئے جائیں تاکہ حق تبلیغ ادا ہو۔ تبلیغ لوگوں تک پیغام پہنچانے کا نام ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ہمارے پاس کتاب ہے، اسے آ کر پڑھ لو۔ نہیں...... اس کو ایک مثال سے سمجھ لیں۔ کچھ لوگوں کو پانی کی ضرورت ہے۔ پانی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ یہ ہے کہ کنویں، تالاب میں پانی موجود ہے ڈول لے کر جاؤ اور پانی لے لو۔ یہ تبلیغ نہیں ہے بلکہ پانی خود ان لوگوں تک پہنچنا چاہئے اور یہ کام کرتا ہے بادل کہ وہ خود پانی لے کر جا پہنچتا ہے تو یہ ہے تبلیغ کا عمل جو بادل ادا کرتا ہے۔ چنانچہ آج افراد کی بھی ضرورت ہے کہ وہ مختلف زبانیں سیکھیں اور قرآن کے پیغام کو تمام قوموں تک ان کی زبان میں پہنچائیں۔ لیکن اس کا مؤثر ذریعہ آج ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ، ریڈیو، اخبارات، رسائل اور آڈیو ویڈیو کیسٹ ہیں۔ جب تک یہ ذرائع استعمال نہ ہوں گے حق تبلیغ ادا نہ ہوگا۔

دوسرا حق الہدیٰ کا یہ ہے کہ پھر ان قوموں میں سے کچھ افراد کو نکال کر لایا جائے اور اُن کو تفصیل کے ساتھ اسلام اور قرآن کی تعلیم دی جائے جسے قرآن مجید دعوت کا نام دیتا ہے۔

﴿ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾
(النحل:125)

''دعوت دو اپنے رب کے راستہ یعنی صراط مستقیم کی طرف دلیل کے ساتھ، اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان سے مناظرہ کرو بہترین طریقہ پر۔

یہ ہیں تین طریقے دعوت قرآن کا حق ادا کرنے کے۔ ایک گروہ وہ ہونا چاہئے جو قرآن مجید کی حکمت حاصل کرے اور پھر دوسروں کے باطل فلسفے پڑھے اور پھر قرآن وحدیث کی تعلیم

کے ذریعہ ان کا باطل ہونا ثابت کرے اور صحیح نظریات اور حکمت قرآنی عام کرے۔

دوسرا گروہ وہ تیار ہو جو عوام الناس تک قرآن کی تعلیم اچھے وعظ کے ذریعے پہنچائے اور تیسرا گروہ وہ ہو جو دوسرے مذاہب کا پرچار کرنے والوں کے ساتھ مناظرہ کرے۔ ان کا غلط ہونا عوام کے سامنے لائے تاکہ ان کے اثرات سے عوام الناس بچ سکیں۔

تیسرا حق الہدیٰ کا یہ ہے کہ اس کی وہ اقدار اور اخلاق حسنہ جو وہ معاشرے میں پروان چڑھانا چاہتا ہے ان کو عام کیا جائے اور جن رذائل اخلاق کی وہ نکیر کرتا ہے ان کی شناعت اور برائی کو مبرہن کیا جائے۔ یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر باللسان، عبدیت، سچائی، امانت ودیانت، عہد کی پاسداری، صلہ رحمی، صبر وشکر، حیاء اور توکل علی اللہ کے اوصاف کے نمونے پیدا کئے جائیں اور ان کی ترویج ہو اور تکبر وغرور، جھوٹ، بددیانتی، بدعہدی، قطع رحمی، غصہ وغیبت، بے حیائی اور فحاشی اور اوہام پرستی جیسی برائیوں کے بارے میں آگاہ کیا جائے اور ان کے مضر اثرات سے معاشرے کو بچانے کی کوشش کی جائے۔

اس کے لئے بھی تمام ذرائع ابلاغ کو استعمال کیا جائے اور پھر کردار کے عملی نمونوں کے ذریعہ مثالیں قائم کی جائیں۔ یہ ہیں تین حق جو الہدیٰ کی شہادت کے لوازمات ہیں اور فریضہ کی ادائیگی اس کے بغیر پوری نہیں ہوتی۔

دین الحق کی شہادت:

دوسری چیز ہے المیزان اور اس کی شہادت جسے قرآن مجید میں اب دین الحق قرار دیا گیا ہے۔

اس شہادت کی اہمیت اس سے عیاں ہوتی ہے کہ سورہ الحج کی آخری آیت میں بھی ذکر دین ہی کا ہے:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ وَفِي هَٰذَا لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ﴾

''اور دین کے بارے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ یہ تمہارے باپ ابراہیمؑ کا طریقہ ہے جس نے تمہارا نام مسلمان رکھا اور اس قرآن میں بھی تمہیں مسلمان قرار دیا گیا ہے تاکہ رسول اللہ ﷺ تم پر گواہ بن جائیں اور پھر تم گواہ بن جاؤ تمام انسانیت کے لئے۔''

سورہ الحدید میں انبیاء ورسل کی بعثت کی غرض وغایت یہی قرار پائی کہ لیقوم الناس بالقسط۔ تا کہ لوگوں میں عدل اجتماعی قائم ہوجائے میزان کے ذریعہ۔

اور پھر نبی اکرم ﷺ کے لئے جو خصوصی آیات نازل کی گئی ان میں دین الحق کا مقصد یہ قرار پایا کہ اسے تمام ادیان پر غالب کیا جائے۔ یہ نہایت ضروری ہے کیونکہ عوام اکثر و بیشتر جس نظام کے تحت ہوں ان کے لئے اس کے خلاف عمل کرنا ناممکن ہوتا ہے اور وہ تابع ہوتے ہیں حکمرانوں اور جاگیرداروں کے۔ کیونکہ انہیں کا دین ان پر مسلط ہوتا ہے۔

دین کیا ہے؟

اب جان لینا چاہئے کہ دین ہوتا کیا ہے۔ دین کے بنیادی معنی تو بدلہ کے ہیں جیسے سورہ فاتحہ میں آیا' مالک یوم الدین اللہ تعالیٰ مختار مطلق ہے بدلے کے دن کا۔ لیکن یہ بدلہ کس بنیاد پر ہوتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ کسی قانون' دستور کی بنیاد پر ہوتا ہے کہ جس کے ماننے اور نہ ماننے پر جزا وسزا ہوتی ہے۔ اس لئے دین نام ہے اس دستور العمل اور ضابطہ حیات کا جو اجتماعی زندگی کی بنیاد ہوتا ہے اور ساری ریاست کے لئے معین ہوتا ہے کہ اس کے تحت ان کے معاملات طے پائیں۔

اس لئے دین کی نسبت اس ہستی کی طرف ہوتی ہے جو یہ دستور بنانے اور اس میں ردوبدل کا اختیار رکھتا ہو جیسے سورۃ یوسف میں آیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائی بنیامین کو اپنے پاس روکنا چاہتے تھے لیکن جو دین الملک وہاں رائج تھا اس کے تحت نہ روک سکتے تھے بلکہ انہوں نے شریعت ابراہیمی کا سہارا لیا جس میں چور کی سزا یہ مقرر تھی کہ اگر چوری ثابت ہوجائے تو چور کو اس کی غلامی اختیار کرنا پڑتی تھی جس کی اس نے چوری کی ہوتی تھی اور اس قانون کے تحت حضرت یوسف علیہ السلام نے تدبیر کی اور بھائی کو روک لیا۔ یہی اطلاق ہوتا ہے آج کل کے جمہوری نظام کے لئے۔ یہ دین الجمہور ہے کیونکہ یہاں اختیار جمہور کے نمائندوں کے پاس ہوتا ہے۔ یہی دین اس وقت دین الحق قرار پائے گا جب یہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے ضابطہ حیات کے موافق ہوجائے گا اور یہی فریضہ رہا ہے ہر رسول کا کہ وہ اس دین کو قائم کرے جس میں دستور العمل یہ قرار پائے کہ تمام معاملات میں یہ طے کرلیا جائے کہ کوئی قانون نہ بنایا جاسکے گا جو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے خلاف ہو۔

اس لئے یہ حقیقت سمجھ لینی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو کیوں ہمیشہ ہر قوم کے

دار الخلافہ میں مبعوث فرماتا رہا ہے کیونکہ ہر قوم میں رائج نظام دار الخلافہ میں قابض بادشاہ/ سرداران قوم کا دیا ہوا ہوتا ہے اور جب تک اسے نہ بدلا جائے دوسرا کوئی دستور رائج نہیں ہوسکتا کیونکہ کسی ریاست/ ملک میں دو دستور نافذ نہیں ہوسکتے۔ جیسے فرمایا ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ﴾ (القصص ۵۹) اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک نہیں کرتا رہا یہاں تک کہ اس کی مرکزی بستی (دار الخلافہ) میں رسول نہ بھیج دے جو ان کو پڑھ کر سنائے ہماری آیات۔ اور ہم نہیں ہلاک کرتے رہے بستیوں کو مگر اس وقت جب ان کے رہنے والے ظلم کرنے لگے اور یہ ظلم کرتے رہے ہیں تمام قوموں کے سردار کہ اللہ کے رسول کے آنے کے بعد بھی ایمان نہیں لاتے اور اپنے ظالمانہ نظام کو نہیں بدلتے کیونکہ ان کے مفادات اور حیثیت اسی استحصالی نظام کی بنیاد پر ہوتی ہے جو وہ چلا رہے ہوتے ہیں۔

رسول کریم ﷺ کا مقصد بعثت

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾ (الشوریٰ:7)

''اور اس طرح ہم نے آپ کی طرف قرآن عربی وحی کیا ہے تا کہ آپ آگاہ کردیں مکہ والوں کو اور جو ان کے چاروں طرف ہیں اور آگاہ کردیں اس جمع ہونے کے دن کے بارے میں جس کے بارے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔''

عرب میں اگرچہ کوئی مرکزی حکومت نہ تھی لیکن دین کے لحاظ سے سکہ قریش ہی کا پورے عرب پر جاری تھا اور وہی ان کے دینی پیشوا تھے اور پورا عرب ان کے تابع تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مکہ والوں نے دین الحق کو قبول نہیں کیا تو سید المرسلین ؐ کو بھی اس طرح ہجرت اختیار کرنا پڑی جیسے پہلے رسولوں کو کرنا پڑی تھی اور یہی وجہ ہے کہ اگرچہ مدینہ میں آپ کی حیثیت کو مان لیا گیا اور پورا مدینہ آپ ؐ کے تابع ہوگیا لیکن عرب کے تمام قبائل ایمان نہیں لائے اور نہ ہی اس تبدیلی کو ''دین عرب'' کی تبدیلی مانا گیا۔ کیونکہ مدینہ والوں کا دین عرب میں رائج نہ تھا لیکن جب مکہ فتح ہوگیا تو پھر پورا عرب اسلام لے آیا اور دین الحق پورے عرب پر قائم ہوگیا کیونکہ نظام شرک کا خاتمہ ہوگیا اور اس کا اختیار رکھنے والے اور اسے رائج کرنے والے مغلوب ہوگئے۔

تخریب حسین کردیتی ہے تعمیر کے نقش ناقص کو

بت خانے کی قسمت کیا کہئے اجڑے تو حرم بن جاتا ہے

اس سے پہلے عرب کے عوام کو دین الحق اختیار کرنے میں کتنی دشواری تھی اور عوام الناس کس طرح مجبور تھے لیکن دین اسلام کے ام القریٰ میں غالب ہونے سے تمام رکاوٹیں دور ہوگئیں اور تمام عرب کے لئے آسانی پیدا ہوگئی تا کہ دین الحق کے تحت اپنا مقصد زندگی پورا کر سکیں۔

5ھ میں سورۂ نور میں اسی لئے مسلمانوں کو یہ بشارت دی گئی تھی کہ جلد ہی یہ خوف وہراس ختم ہو جائے گا اور اللہ اپنے دین کو تمکن عطا کرے گا اور تمہیں خلافت ارضی سے نوازے گا۔

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِن قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ط يَعْبُدُوْنَنِىْ لاَ يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْئًا ط وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ (النور:55)

''اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے اپنے مومن بندوں سے جو عمل صالح اختیار کئے ہوئے ہیں کہ ان کو لازماً زمین کی خلافت عطا کرے گا جیسے اس نے پہلوں کو خلافت عطا کی اور لازماً ان کے دین جس کو اس نے پسند فرمایا ہے تمکنت عطا کرے گا اور ان کی خوف کی حالت لازماً امن میں بدل دے گا تا کہ وہ میری بندگی کا حق ادا کرتے ہوئے زندگی گزاریں اور میرے مقابلے میں کوئی معبود نہ رہے۔ پھر اگر کوئی کفر کی روش اختیار کرے گا تو وہ ہوگا اصل میں نافرمان۔''

یہ ہے وہ غلبہ دین الحق جو اللہ تعالیٰ تمام رسولوں کا مقصد بعثت قرار دے رہے ہیں اور دنیا میں اس کا نفاذ بالفعل کرتا رہا ہے۔ یہ اتنا اہم فریضہ تھا کہ اگر باطل نظام کے بااختیار مترفین نے اس کو قبول نہیں کیا تو اللہ تعالیٰ ان کو اور پوری قوم کو ہلاک کرتا رہا ہے اور پھر اپنے رسولوں کے ذریعہ دنیا میں وہ نظام حق رائج کرواتا رہا ہے جو ان کو دے کر بھیجتا تھا۔ یہی ہوا ہے حضرت نوحؑ، ہودؑ، شعیبؑ اور موسیٰ علیہم السلام کے ذریعہ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول سید المرسلینؐ کی قوم کو ہلاک نہیں کیا۔ اگرچہ 13 سال تک ان کو دعوت دینے کے باوجود انہوں نے نہیں مانا اور پہلے رسولوں کی طرح آپؐ کو ہجرت کرانا پڑی۔ اس لئے کہ آپؐ آخری رسول تھے اور آپؐ کے بعد یہ فریضہ اُمت کے سپرد ہونے والا تھا۔ اگر آپ کے دور میں بھی یہ کام معجزہ سے ہو جاتا تو بعد والوں کے لئے نمونہ نہ بنتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپؐ سے غلبہ دین حق انسانی جدوجہد کے ذریعہ کروایا

اور ان تمام مراحل سے اپنے رسول اور اُمت کو گزارا جو اس کیلئے ناگزیر تھے تا کہ بعد والوں کے لئے اسوہ حسنہ موجود رہے اور امت اپنا فریضہ ادا کرنے کے لئے رہنمائی حاصل کرتی رہے۔

نبی اکرم ﷺ کی خصوصی حیثیت:

نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت قرآن مجید میں تین مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ اگر ان مقامات کا سیاق وسباق دیکھا جائے تو بات زیادہ نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔

پہلی دفعہ یہ آیت نازل ہوئی سورہ الصّف میں۔

﴿هُوَالَّذِىْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ (الصف: 9)

''وہ اللہ ہے جس نے بھیجا اپنے رسول ﷺ کو الہدیٰ اور دین الحق دے کر تا کہ دین الحق کو غالب کریں تمام ادیان پر اگرچہ مشرکوں کو کتنا ہی ناپسند ہو۔''

یہ وہ موقع تھا جب پورا عرب جمع ہو کر مدینہ پر چڑھ دوڑا تھا اور مسلمانوں پر بہت کڑا وقت تھا۔ ان حالات میں فرمایا گیا کہ گھبراؤ نہیں۔ ہم نے تو اپنے رسول ﷺ کو بھیجا ہی اس لئے ہے کہ وہ دین الحق کو غالب کریں تمام ادیان پر۔ لیکن اس کے لئے جان و مال تو ایمان والوں کو لگانا پڑے گا اور دیکھو عنقریب ہم تمہیں غلبہ عطا فرمائیں گے اور اے رسول (ﷺ) مسلمانوں کو بشارت دیجئے۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ط ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِىْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ط ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَ اُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾

ایمان والو! میں بتلاؤں تم کو ایسی سوداگری جو بچائے تم کو ایک عذاب دردناک سے۔ ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں، اپنے مال سے اور اپنی جان سے، یہ بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ بخشے گا وہ تمہارے گناہ اور

داخل کرے گا تم کو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں اور ستھرے گھروں میں بسنے کے باغوں کے اندر یہ ہے بڑی مراد ملنی اور ایک اور چیز دے جس کو تم چاہتے ہو۔ مدد اللہ کی طرف سے اور فتح جلدی اور خوشی سنادے ایمان والوں کو۔ (اصف ۱۲۔۱۰)

چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے اس کے بعد فرما دیا تھا۔ اے مسلمانو! اب قریش تم پر دوبارہ حملہ آور نہ ہوسکیں گے بلکہ تم قریش پر حملہ آور ہو گے۔

لیکن پھر دوبارہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب صلح حدیبیہ سے یہ مغالطہ پیدا ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا تھا کہ دین الحق تمام ادیان پر غالب ہو گا لیکن یہاں یہ مان لیا گیا کہ دین قریش بھی جاری رہے اور دین الحق بھی اور اس معاملے میں باہم جنگ نہ ہو گی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے پھر آیت نازل فرمائی اور واضح کیا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو اسی لئے بھیجا ہے کہ دین الحق غالب ہو۔ (یعنی یہ صلح کا معاملہ اور دین قریش کو مہلت کا معاملہ وقتی/ عارضی ہے) اور جان لو اللہ تعالیٰ کافی ہے مددگار یا گواہ کہ یہ ہو کر رہے گا۔ ﴿**ھوالذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہٖ و کفی باللہ شھیداً** ﴾ (الفتح ۲۸) چنانچہ تقریباً ڈیڑھ سال میں دین الحق کا غلبہ ہو گیا۔ فتح مکہ کے ساتھ ہی تمام عرب نے دین اسلام کے غلبہ کو قبول کر لیا اور اللہ کی حکمرانی پورے عرب میں نافذ ہو گئی۔ کیونکہ پہلا دین اور اس کے محافظ مغلوب ہو گئے۔ گویا وہ مقصد جو تمام رسولوں کا تھا کہ لوگوں میں عدل اجتماعی قائم ہو وہ پورا ہو گیا۔ اب پھر تیسری بار اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ کو نازل کیا اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کہ دین الحق کا غلبہ صرف مشرکین عرب کے دین پر ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس دین الحق کو سابقہ تمام ادیان پر بھی غالب کرنا ہے کیونکہ ان کی مدت ختم ہو گئی اور اب وہ دین نہیں رہے بلکہ اب تمام انبیاء ورسل کے امتیوں کو بھی اسی دین الحق کے تابع رہنا ہو گا اور انفرادی طور پر اگر وہ چاہیں تو اپنے دین کو مذہب کے طور پر جاری رکھیں یعنی عقائد' عبادات ورسومات کی حد تک اپنے دین پر عمل کرتے رہیں لیکن اجتماعی زندگی میں ان کو دین الحق کے تابع رہنا ہو گا۔ چنانچہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ:

﴿**قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لاَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلاَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلاَ يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلاَ يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ** ﴾ (التوبہ: 29)

''اے مسلمانو تمہاری جنگ جاری رہنا چاہئے ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ

پر اور آخرت کے دن پر اور ان کے ساتھ جو ان چیزوں کو حرام قرار نہیں دیتے جنہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہے اور ان کے ساتھ جو دین الحق کو اپنا دین نہیں مانتے۔ اہل کتاب میں سے بھی یہاں تک وہ جزیہ ادا کریں اور دین الحق کے نیچے رہ کر زندگی گزاریں''۔

یہ ہے وہ مقصد جو سید المرسلین احمد المجتبیٰ اور آخر الرسل ؐ کا قرار دیا گیا ہے کہ وہ دین الحق جو ان کو دیا گیا ہے وہ تمام زمین پر غالب ہو اور باقی تمام ادیان اس کے تابع ہو جائیں اور مذہب کی حیثیت سے چاہے جاری رہیں لیکن وہ دین کے طور پر رائج نہیں رہنے چاہئیں۔

لیکن صد افسوس ہے کہ جن اہل کتاب کے بارے میں حکم آ گیا تھا کہ ان کو اپنا دین اب دین الحق بنانا ہو گا اور اگر دین الحق کو قبول نہ کرنا ہو تو اپنے دین کو مذہب بنا لیں۔ یعنی انفرادی زندگی میں اسی پر عمل پیرا رہیں لیکن اجتماعی اور ریاستی معاملات میں ان کو دین الحق کے تابع رہنا ہو گا۔ کیونکہ یہ دین ہے جو اللہ تعالیٰ نے اب ساری انسانیت کے لئے قیامت تک پسند فرما لیا ہے۔ وہ آج اپنا دین تمام دنیا پر غالب کئے ہوئے ہیں اور مسلمانوں' حامل الھدیٰ اور دین الحق ان کے دین کے تحت مذہب اسلام پر عمل پیرا ہیں اور گویا جزیہ ادا کرتے ہوئے زندگی گزار رہے ہیں۔

یہ حالت کیوں ہوئی' اس لئے کہ دین اسلام کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر لازم کر دیا تھا کہ وہ جماعتی زندگی کا التزام کریں اور اجتماعی قوت کے ساتھ اس دین کو غالب رکھیں لیکن جب دین و دنیا کی تقسیم مسلمانوں میں راسخ ہوئی تو دین مذہب بن گیا اور دنیا میں سیاسی اقتدار علیحدہ سمجھ لیا گیا اور جب امت میں ذاتی اقتدار کی ہوس کے تحت علاقائی حکومتیں بن گئیں تو اجتماعیت ختم ہو گئی اور امت قوموں میں بٹ گئی اور سیاسی اقتدار سے محروم ہو گئی۔ گویا دین الحق والا حصہ ان سے چھن گیا اور وہاں مغرب کی اجارہ داری قائم ہو گئی اور مسلمان صرف مذہب اسلام کو ہی سب کچھ سمجھ کر اس پر قانع ہو کر زندگی گزارنے لگے اور اس کی بنیاد پر مسلکوں میں بٹ گئے اور ان کی قوت پارہ پارہ ہو گئی اور مذہب کے لئے چونکہ اجتماعی زندگی ضروری نہیں تھی اس لئے جماعتی نظم ختم ہو گیا۔ اب علماء کرام جو اصل دین کے حامل تھے وہ چونکہ مذہب اسلام پر عمل پیرا ہیں اس لئے ان کے ہاں کوئی نظم جماعت نہیں ہے حالانکہ دین اسلام/ دین الحق کا تو تصور بغیر جماعتی زندگی کے محال ہے۔ اس جماعت کی شرائط یہ ہیں کہ وہ دین کے غلبہ کیلئے ہو۔ اس کا نظم سمع وطاعت کے مسنون نہج پر ہو۔ اس کی قیادت میں للٰھیت نظر آئے۔ اسی لئے سورہ الصف ہی میں فرمایا گیا:

﴿**يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ**﴾ (الصف: 14)

”اے ایمان والو! اللہ کے مددگار بن جاؤ اور ہمارے رسول کی نداء پر لبیک کہتے ہوئے خود کو جماعتی نظم میں دو جس کی رسول اللہ ﷺ نے بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر ابتدا فرمائی کہ مدینہ کے 75 افراد میں سے 12 نقباء مقرر کئے اور پھر ان کی اطاعت کے لئے بیعت لی۔ چنانچہ حضرت عبادہ بن الصامت فرماتے ہیں:

((بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ، فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ، وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ، وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا، وَعَلٰی اَنْ لاَ نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ، وَعَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا، لاَ نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لاَئِمٍ)) (متفق علیہ)

”ہم نے بیعت کی رسول اللہ ﷺ سے سننے اور ماننے کی' آسانی میں بھی اور تنگی میں بھی۔ دل کی آمادگی پر بھی اور کراہت پر بھی اور اس پر بھی کہ خواہ ہم پر دوسروں کو ترجیح دے دی جائے اور ہم جھگڑا نہ کریں گے اہل امر کے ساتھ اور حق بات کہنے کی جہاں موقع ہو اور اللہ کے معاملے میں ہم کسی ملامت گر کی ملامت کی پرواہ نہ کریں گے۔“ (متفق علیہ)

یہ ہے دین کے لئے اجتماعیت کی بنیاد اور جس کے بارے میں ارشاد ہے حضرت عمرؓ کا۔

لا اسلام الا بالجماعۃ (سنن دارمی)

”اسلام کا کوئی تصور نہیں ہے بغیر اجتماعیت کے“۔

اور قول رسول اللہ ﷺ

”یَدُ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ“

اللہ کی تائید اور نصرت جماعت کے ساتھ ہوتی ہے اور جس کے بارے میں ایک دوسرا فرمان نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام ہے۔

عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَۃِ اِیَّاکُمْ وَالْفُرْقَۃَ فَاِنَّ الشَّیْطٰنَ مَعَ الْوَاحِدِ وَھُوَ مِنَ الْاِثْنَیْنِ اَبْعَدُ مَنْ اَرَادَ بَحْبُوْحَۃَ الْجَنَّۃِ فَلْیَلْزَمِ الْجَمَاعَۃَ (الترمذی)

”اے مسلمانو! جماعت کا التزام کرو اور انفرادی زندگی گزارنے سے بچو۔ کیونکہ جب انسان اکیلا ہو تو شیطان ساتھی بن جاتا ہے اور جب دو انسان جماعت کی صورت اختیار کرلیں تو وہ ان سے دور رہتا ہے۔ جس کو جنت کی خوشگواری مطلوب ہو اس کو التزام جماعت کرنا چاہئے۔“

اگر آج امت مسلمہ کو یہ بھولا ہوا سبق یاد کروا دیا جائے کہ دین اسلام کا لازمی تقاضا جماعتی

زندگی ہے کہ اس کے بغیر دین الحق کا غلبہ ممکن نہیں اور ہر مسلمان پر التزام جماعت لازم ہے تو آج بھی مسلمان یکجا ہو کر دین کے غلبہ کے لئے جماعت بنائیں اور پھر دین کو اپنے ملک میں غالب کرنے کے لئے جہاد کرنا شروع کردیں جیسے جہاد کا حق ہے تو آج پھر دین الحق غالب ہوسکتا ہے اور نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت مکمل ہوسکتا ہے اور پوری زمین پر اللہ کی حکمرانی رائج ہوسکتی ہے اور دوبارہ خلافت راشدہ کا نظام قائم ہوسکتا ہے جس کے لئے پیشینگوئی کر رکھی ہے نبی اکرم ﷺ نے کہ یہ دین تمام روئے ارضی پر غالب ہو کر رہے گا اور ہر جگہ میں داخل ہو کر رہے گا خواہ گھر والے کی عزت کے ساتھ یا گھر والے کی ذلت کے ساتھ یعنی وہ مغلوب ہو اور جزیہ ادا کرے اور دین الحق کی حکمرانی کے زیر سایہ زندگی گزارے۔

یہی دعوت ہے اور فریضہ ہے جس کی خاطر تنظیم اسلامی بنائی گئی ہے کہ مسلکوں سے اوپر اُٹھ کر دین کے غلبہ کے لئے کام کیا جائے کیونکہ مسلک تو سارے اسلام کے اندر ہی ہیں لیکن دین اللہ کہیں غالب نہیں ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کے دیئے ہوئے ضابطہ حیات کو کسی ملک میں بھی غلبہ حاصل نہیں ہے۔ کہیں شہنشاہیت چل رہی ہے اور کہیں جمہوریت حالانکہ مطلوب ہے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور انسانوں کی خلافت جو پابند ہو اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کی۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور تمام مسلمانوں کو اپنا مقام پہچاننے اور فضیلت امت کو حاصل کرنے اور اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔